ادارہ تحقیق و تصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی

ITTI

IDARA-E-TAHQEEQ-O-TASNEEF-E-ISLAMI

پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ

۲۰۲۰۰۱

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی کا سہ ماہی ترجمان

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

جنوری ـــــــــ مارچ ۱۹۹۵ء

—: ایڈیٹر :—

سیّد جلال الدّین عمری

پان والی کوٹھی دودھ پور علی گڑھ

۲۰۲۰۰۱

ISLAMIC [illegible] CENTRE
Jamia [illegible] Rd,
BANGALORE - 560 002.

سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ

جلد ۱۴ شمارہ ۱

جنوری ——— مارچ ۱۹۹۵ء

شعبان المعظم ——— شوال المکرم ۱۴۱۵ھ

زرتعاون

اندرون ملک ——— فی شمارہ ۱۶ روپے

سالانہ ۶۰ روپے

لائبریری و ادارے ۸۰ روپے سالانہ

بیرون ملک ——— انفرادی خریدار ۱۰ ڈالر/ ۳۰۰ روپے

لائبریری و ادارے ۱۵ ڈالر/ ۴۵۰ روپے

پاکستان ——— انفرادی ۱۲۰ روپے سالانہ

ادارے ۱۵۰ روپے "

طابع و ناشر سید جلال الدین عمری نے انٹرنیشنل پرنٹنگ پریس علی گڑھ کے لیے نازیہ پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، پان والی کوٹھی دودھ پور علی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

حرفِ آغاز

مسلمان عورت سے متعلق ایک سوالنامہ کا جواب	سید جلال الدین عمری	۵

تحقیق و تنقید

اسلامی ادبیات میں خضر کا تصور	ڈاکٹر غلام قادر لون	۱۳
دعوتِ نبوی کے طریقے	ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی	۳۵

بحث و نظر

فلسفہ نظم قرآن۔ ایک متوازن نقطۂ نظر	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۶۷

سیاساتِ عالم

حزب الرفاہ اور اس کا اسلامی تناظر	ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی	۹۱

ترجمہ و تلخیص

اعضا کی پیوندکاری	ڈاکٹر منور حسین فلاحی	۱۰۹

تعارف و تبصرہ

ایرانی تصوف	ڈاکٹر منور حسین فلاحی	۱۱۷
اسلام اور اکیسویں صدی کا چیلنج	ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی	۱۱۸

اس شمارہ کے لکھنے والے

۱۔ ڈاکٹر غلام قادر لون

حدی پورہ (رفیع آباد) بارہ مولہ۔ کشمیر

۲۔ ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

پروفیسر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۳۔ مولانا سلطان احمد اصلاحی

رکن ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

۴۔ ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی

استاذ شعبۂ اسلامک اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۵۔ منور حسین فلاحی

استاذ شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۶۔ ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی

رکن ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

۷۔ مولانا سید جلال الدین عمری

سکریٹری ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

:- خوش نویس :-

احراز الحسن جاوید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

مسلمان عورت سے متعلق ایک سوالنامہ کا جواب

سید جلال الدین عمری

معروف دینی وعلمی ماہنامہ 'ترجمان القرآن' لاہور کی طرف سے کئی ماہ قبل ایک سوالنامہ موصول ہوا تھا۔ یہ سوالنامہ موجودہ دور میں ایک دین دار عورت کے مسائل، عورت کے ساتھ مسلم معاشرہ کا رویہ، اسلامی تحریکات کی اصلاحی کوششیں، آئندہ کی توقعات جیسے اہم سوالات پر مشتمل تھا۔ ذیل کے مضمون میں اسی کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ (جلال الدین)

موجودہ دور میں دین دار عورت کے مسائل اور مشکلات

یہاں پہلے بعض ان مسائل کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے جن سے آج کی مسلمان عورت دوچار ہے۔

مغرب نے جو مسائل پیدا کیے ہیں ان میں بنیادی مسئلہ اس کے فلسفۂ حیات کا ہے، اس کا حملہ اتنا زبردست اور اس کا دباؤ اتنا شدید ہے کہ مسلمان عورت کو استقلال اور استقامت کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ وہ قدم قدم پر محسوس کرتی ہے کہ یہ پورا فلسفہ اس کی راہ میں مزاحم ہی نہیں بلکہ اسے ایک دوسری ہی سمت میں لے جانا چاہتا ہے۔ اس میں خدا پر ایمان ویقین، اس کی عبادت واطاعت، رسول کی رسالت، اس کی ہدایت اور راہنمائی اور آخرت کی بازپرس کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ وہ دین کی ان بنیادی حقیقتوں کا انکار کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے اور ان سے آزاد ہو کر زندگی کی تعمیر چاہتا ہے۔ یہ ایک زبردست ذہنی کشمکش ہے جس سے مسلمان عورت دوچار ہے۔ (یہ کشمکش مسلمان مرد کے لیے بھی ہے یہاں زیر بحث مسلمان عورت کے مسائل ہیں۔ اس لیے صرف اسی کا ذکر ہے)

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مسلمان عورت گھر اور خاندان کو اپنا اصل مرکز توجہ اور حقیقی دائرۂ کار سمجھتی ہے۔ مغربی تہذیب اسے اس مرکز سے ہٹانے کی بھرپور کوشش میں لگی ہوئی ہے۔ وہ گھر میں گھس کر اس کے سکون پر حملہ آور ہو رہی ہے اور اسے بے یقینی اور اضطراب میں مبتلا کرنا چاہتی ہے۔ مغرب جن پہلوؤں سے اسلام پر اپنی یورش جاری رکھے ہوئے ہے ان میں اس کے نظامِ خاندان کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ وہ مختلف عنوانات سے یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتا ہے کہ اسلامی خاندان عورت کے لیے ایک قید خانہ سے کم نہیں ہے، اس کی بنیاد مرد کے اقتدار پر ہے۔ اس میں عورت کی حیثیت ایک محکوم سے زیادہ نہیں ہے، اس کے حقوق غیر محفوظ اور اس کی ذمہ داریاں بے شمار ہیں، وہ پیدائش سے لے کر شادی تک ماں باپ کی دست نگر اور شادی کے بعد شوہر کی باندی ہے، اسے جب چاہے طلاق کے دو لفظ بول کر گھر سے نکالا جا سکتا ہے، اس کی معاش کا کوئی نظم نہیں ہے اور وہ مرد کے ہاتھ میں مجبور و محبوس ہے۔

خاندانی نظام پر اس فکری یلغار یا لگاتار حملوں کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان عورت اس نظام ہی سے متنفر ہو جائے، اسے ایک ظالمانہ نظام سمجھے اور اس کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو جائے۔ وہ آگے بڑھ کر ماں باپ سے، شوہر سے اور پورے خاندان سے بغاوت کر دے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عورت کی بغاوت کے بعد خاندان اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکتا اور اسے شکست و ریخت سے کوئی طاقت بچا نہیں سکتی۔ خاندان، معاشرہ کا بنیادی ادارہ ہے۔ اسلام آج بھی یہاں بڑی حد تک زندہ اور محفوظ ہے۔ اگر یہ ادارہ ختم ہو جائے تو اجتماعی زندگی کے دوسرے اداروں سے وہ آسانی سے ختم ہو جائے گا۔ مغربی تہذیب یہی چاہتی ہے۔

مغرب میں عورت اور مرد کی مساوات کا ایک خاص تصور پایا جاتا ہے۔ یہ ایک غیر فطری تصور ہے۔ اسی وجہ سے خود مغرب میں اسے پوری طرح اپنایا نہیں جا سکا ہے۔ عورت اور مرد کی صلاحیتوں کا فرق اس میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ لیکن اس تصور کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ یہ ہر تنقید سے بالاتر ہے۔ چنانچہ اس کے خلاف زبان کھولنے کی ہمت بھی مشکل ہی سے کی جاتی ہے۔

مساوات کے اس تصور کے تحت مسلمان عورت کو یہ باور کرانے کی مسلسل کوشش ہو رہی ہے کہ خاندان ہی میں نہیں، اس سے ہٹ کر زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی

اسلام اسے مرد کے مساوی درجہ دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اسے وہ حقوق حاصل نہیں ہیں جو بحیثیت ایک انسان کسی مہذب معاشرہ میں ملنے چاہئیں۔ اسے مرد سے کم تر سمجھا جاتا ہے، اس کی شہادت آدھی شہادت ہے، اس کی دیت نصف دیت ہے، وراثت میں اس کا حصہ آدھا ہے۔ ملازمت، تجارت اور صنعت و حرفت میں اس کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ حکمرانی کے منصب پر وہ کبھی فائز نہیں ہو سکتی۔ مسلمان عورت کی مظلومیت کی یہ داستان دورِ جدید کے طاقت ور ذرائع ابلاغ سے اس زور شور سے سنائی جا رہی ہے کہ دل و دماغ کا اس سے متاثر و مرعوب ہونا تعجب خیز نہیں ہے جبکہ اسلام کا موقف اتنی ہی قوت کے ساتھ سامنے نہیں آرہا اور ماحول بھی اس کے مخالف ہے۔

مسلمان عورت عملی کشمکش میں بھی مبتلا ہے۔ ایک طرف اس کے خیالات زمانہ کے خیالات سے متصادم، اس کے سوچنے کا انداز معاصر فکر سے مختلف، اس کے ذوق اور دل چسپی کا دائرہ آج کی دنیائے تفریح سے جدا اور دوسری طرف اس کا صوم و صلوٰۃ اور عبادات کا پابند ہونا، اخلاقی اقدار پر اس کا اصرار، موجودہ عریاں کلچر اور آرٹ سے اس کی دوری، شرم و حیا کو اس کا زینت سمجھنا، اس کا لباس اور اس کا حجاب یہ سب چیزیں آج کے ماحول میں اسے بالکل اجنبی بنا کر رکھ دیتی ہیں وہ یوں محسوس کرتی ہے جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو اور دین و اخلاق کی صاف ستھری فضا میں وہ سانس لینا چاہے تو بھی نہ لے پا رہی ہو۔ اگر اتفاق سے اور اب یہ محض اتفاق ہی نہیں رہا بلکہ ایک عمومی واقعہ بن گیا ہے، ماں باپ، شوہر یا خاندان کے دوسرے افراد غیر اسلامی ذہن و مزاج کے ہوں تو مسلمان عورت کی کشمکش اپنے گھر ہی سے شروع ہو جاتی ہے۔ یہ کشمکش بڑی سخت ہوتی ہے۔ اپنے قریبی ماحول کے ناسازگار ہونے کی وجہ سے اسے بے شمار دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

موجودہ حالات میں ایک مسلمان خاتون جن مسائل سے دوچار ہے ان میں ایک اہم مسئلہ بچوں کی تعلیم و تربیت کا ہے۔ آج علم محض چند طبعی یا فکری معلومات میں اضافہ کا نام ہے۔ ہمارے تعلیمی ادارے طالب علم کو ادبی، سماجی اور سائنسی معلومات تو فراہم کرتے ہیں لیکن ان معلومات کو صحیح رخ نہیں دے پاتے، اس لیے طالب علم کی ذہنی و فکری تربیت نہیں ہوتی اور معلومات کا یہ بوجھ کبھی دین سے انحراف کا سبب بن جاتا ہے۔ تعلیمی اداروں سے باہر کی دنیا اخلاقی بگاڑ ہی میں اضافہ کرتی ہے۔ بسا اوقات گھر کا ماحول بھی اصلاح و تربیت میں معاون نہیں ہوتا۔

ان حالات میں اسلامی ذہن وفکر رکھنے والی خاتون جب دیکھتی ہے کہ نئی نسل جس میں اس کی اولاد بھی شامل ہے غیر اسلامی افکار کے سیلاب میں بہی چلی جارہی ہے اور اسے وہ روک نہیں پارہی ہے تو اسے دنیا تاریک نظر آنے لگتی ہے۔ اس کی اس پریشانی اور فکرمندی کا تصور کرنا دشوار نہیں ہے۔

یہ تو بعض مسائل اور دشواریاں ہیں۔ مخالف ماحول میں اس طرح کی دشواریوں کا پیش آنا تعجب خیز نہیں ہے۔ ان کا پیش نہ آنا تعجب کا باعث ہوسکتا ہے۔ ان سے ہراساں ہونے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے مسلمان خاتون اپنے دین و ایمان، خدا سے تعلق اور استعانت اور حکمت وتدبیر سے ان پر قابو پاسکتی ہے۔ اگر وہ اس فیصلہ اور عزم ویقین کے ساتھ کھڑی ہو کہ حق پر قائم رہے گی اور غیر اسلامی ماحول کو بدلنے کی راہ میں جو مشکلات پیش آئیں گی انھیں خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرے گی تو اللہ تعالیٰ کی نصرت اسے حاصل ہوگی، رکاوٹیں دور ہوں گی۔ ظلمت شب چھٹے گی اور کامیابی کی سحر طلوع ہوگی۔

مسلم معاشرہ میں عورت کی حیثیت

موجودہ مسلم معاشرہ میں (خاص طور پر برصغیر کے پس منظر میں) عورت کی حالت بڑی ابتر رہی ہے۔ وہ ان حقوق سے بڑی حد تک محروم تھی اور ہے جو اسلام نے اسے عطا کیے ہیں۔ دورِ جاہلیت کی طرح لڑکی کو ایک بوجھ سمجھا جاتا ہے۔ اس کی پیدائش پر خوشی نہیں محسوس کی جاتی بلکہ ماں باپ اور گھر کے لوگوں پر ایک طرح کی افسردگی چھا جاتی ہے، پیدائش کے بعد اس کی پرورش اور تعلیم وتربیت کی طرف وہ توجہ نہیں کی جاتی جو لڑکوں کے سلسلہ میں کی جاتی ہے، اس کی تعلیم صحیح معنی میں نہ قدیم ہوتی ہے اور نہ جدید، اس کی معلومات کی دنیا خاندان کے طور طریقوں اور رسوم و رواج تک محدود ہوتی ہے، اس کی واقفیت نہ تو قرآن وحدیث کی تعلیمات سے ہوتی ہے اور نہ جدید علوم سے، زندگی کے کسی شعبہ میں اسے وہ بصیرت حاصل نہیں ہوتی کہ دینی اور دنیوی نقطۂ نظر سے صحیح اور غلط کا فیصلہ کرسکے، قومی اور بین الاقوامی معاملات سے وہ بے خبر ہوتی ہے، دنیا میں کیا تبدیلیاں آرہی ہیں، کیوں آرہی ہیں اور ان کے پیچھے کیا اسباب وعوامل ہیں ان کا اسے کوئی علم نہیں ہوتا، ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ دنیا کے بھلے برے سے کٹ کر رہ گئی ہے۔ اس میں شک نہیں اس صورت حال میں کہیں کہیں تبدیلی ضرور آئی ہے اور ہماری

خواتین نے علم کے میدان میں نمایاں ترقی کی ہے لیکن ایک طویل عرصہ سے وہ تعلیم میں اس قدر پیچھے رہی ہیں کہ اس کی تلافی کے لیے ایک لمبی مدت درکار ہوگی۔

اب تعلیم سے ہٹ کر بعض دوسرے معاملات پر غور فرمائیے۔ شادی کے وقت مہر کی بڑی بڑی مقدار طے ہوتی ہے لیکن اس کے ادا کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی، شادی کے بعد اس کی ذمہ داریاں تو بیان ہوتی رہتی ہیں، ان میں وہ ذمہ داریاں بھی شامل ہیں جن کا ازروئے شرع کوئی جواز نہیں ہے۔ اس کی عمر کا بہترین حصہ ساس بہو کے جھگڑوں اور سسرال کے غلط سلوک کی نذر ہو جاتا ہے۔ ماحول کی سختی کی وجہ سے اس کی قوت و توانائی ضائع ہوتی چلی جاتی ہے اور وہ خاندان اور سماج کے لیے مفید خدمت انجام نہیں دے پاتی۔ منقولہ اور غیر منقولہ جائداد میں اسے وراثت سے محروم رکھا جاتا ہے، بیوہ یا مطلقہ ہو جانے پر اس کا دوبارہ نکاح ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔ بعض اوقات اس کی پوری عمر بے شوہر کے گزر جاتی ہے۔ ان حالات میں مسلمان عورت کے اندر ایک طرح کی مایوسی کا پایا جانا فطری ہے۔ وہ یہ سمجھتی ہے کہ اسے نظر انداز کیا جا رہا ہے، اس کی کمزوری اور مجبوری کا استحصال ہو رہا ہے، اس کے دینی اور سماجی فرائض اور ذمہ داریوں کا تو ہر طرف چرچا ہے اور ان کے پورے کیے جانے کا مطالبہ بھی شدت سے ہوتا رہتا ہے لیکن اس کے حقوق ادا کرنے کی فکر نہیں ہوتی۔ یہ احساس عملاً اسے آہستہ آہستہ اسلام سے دور کر رہا ہے۔ اس کے اندر اسلام سے نظریاتی یا فکری بغاوت تو بالعموم نہیں ہے لیکن اسلام سے جس قسم کا تعلق اور وابستگی ہونی چاہئے وہ کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ اسے اسلامی معاشرہ میں وہ کشش نظر نہیں آتی جو اس سے جڑے رہنے اور اسے مستحکم بنانے کے لیے ضروری ہے۔

تحریکات اسلامی کی اصلاحی کوششیں

اسلامی تحریکوں نے اس صورت حال کو بدلنے کی مختلف پہلوؤں سے جو کوشش کی ہے اس کا اعتراف نہ کرنا بڑی زیادتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں جہاں تک ان تحریکوں کے اثرات ہیں ایک طرف تو مسلمان عورت کو اس کے اسلامی حقوق مل رہے ہیں۔ دوسری طرف خود مسلمان خواتین کے ایک طبقہ میں دین کا صحیح شعور پیدا ہو رہا ہے، ان میں سے بعض اسلامی جذبات سے سرشار ہیں اور حالات کا مقابلہ کر رہی ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس

کے اثرات بہت محدود ہیں، سماج میں اس سے کوئی بڑی محسوس تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔ آج بھی مسلمان عورت اسلام کی واضح تعلیمات سے متصادم اور مخالف ماحول میں زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔

جب اسلام غالب ہوگا

اسلام اور غیر اسلام کی کشمکش کا یہ دور ختم ہونے کے بعد مسلمان عورت، یقین ہے کہ ایک نئی زندگی اور نئی توانائی کے ساتھ میدان عمل میں آئے گی۔ اس کے چند نمایاں پہلو یہ ہوں گے۔

غیر اسلامی افکار و نظریات اس کے لیے اپنی کشش کھو دیں گے۔ ان کے جھوٹے پروپیگنڈے اور کھوکھلے نعروں کی تاثیر ختم ہو جائے گی۔ مسلمان عورت اسلامی فکر کی علم بردار اسلامی سیرت کی حامل اور اسلامی حدود و آداب کی پابند ہوگی۔ اس کی پوری زندگی اسلامی قالب میں ڈھل جائے گی۔

وہ علم کی دولت سے آراستہ، دنیادی مسائل سے واقف اور دینی بصیرت کی حامل ہوگی، اس وجہ سے اسے کسی فکری اضطراب میں مبتلا کرنا اور دین سے پھیرنا آسان نہ ہوگا۔

اسلام نے اسے جو حقوق دیئے ہیں، چاہے ان کا تعلق عائلی زندگی سے ہو یا سیاسی سماجی اور معاشی زندگی سے، وہ ان سب سے بہرہ ور ہوگی اور اس احساس سے دوچار نہ ہوگی کہ اسلامی معاشرے میں بھی اسے ان حقوق کے لیے جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اسے وہ ان کا محافظ پائے گی۔ موجودہ دور کے پرفریب تصور مساوات کی جگہ حقیقی مساوات سے روشناس ہوگی۔

مسلمان عورت کو اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا بھی احساس ہوگا۔ وہ خانگی ذمہ داریوں کو حقیر نہیں سمجھے گی بلکہ معاشرہ کی تعمیر میں خاندان کی جو اہمیت ہے اسے وہ اہمیت دے گی، اسے اسلام کا مضبوط قلعہ بنانے میں شوہر کی معاون ہوگی اور آنے والی نسل کو اسلامی سیرت و کردار میں ڈھالنے کی کوشش کرے گی۔

مسلمان عورت کا ملکی و ملّی مسائل سے مضبوط تعلق ہوگا، وہ ملک و ملت کی فلاح و بہبود کے لیے فکر مند ہوگی اور اس کے لیے مناسب تدابیر اختیار کرے گی۔ اجتماعی زندگی میں موثر کردار ادا کرے گی، رائے مشورہ اور نقد و احتساب میں شریک ہوگی اور جہاں کوئی خامی دیکھے گی اس کی اصلاح کی کوشش کرے گی۔

اسلامی تحریکوں کے لیے بعض توجہ طلب پہلو

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامی تحریکوں میں مسلمان خواتین کا جو حصہ ہونا چاہئے وہ نہیں ہے۔ حالانکہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ذمہ داری مرد اور عورت دونوں پر ڈالی گئی ہے۔ یہ اسلام کا دعوتی مقصد بھی ہے اور سیاسی بھی۔ اسلام جس معاشرہ کی تعمیر چاہتا ہے اس کا اس وقت تک تصور نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ دونوں معروف کو قائم کرنے اور منکر کو مٹانے میں نہ لگ جائیں۔ قرآن مجید اس پاک مقصد کے لیے دونوں کے باہم تعاون کو ضروری قرار دیتا ہے۔ یہی حقیقت سورۂ توبہ کی اس آیت میں بیان ہوئی ہے۔

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ	ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں
بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ	ایک دوسرے کے معاون اور مددگار ہیں۔
بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ	وہ معروف کا حکم دیتے اور منکر سے منع کرتے
الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ	ہیں۔ نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں
الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ	اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے
أُولَٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ	ہیں یہی لوگ ہیں جن پر اللہ رحم کرے گا۔ بے شک
حَكِيمٌ (التوبۃ : ۷۱)	اللہ زبردست اور حکمت والا ہے۔

دور اول کی تاریخ ہمارے سامنے ہے، اللہ کے دین کے قبول کرنے، اس کے لیے تکلیفیں برداشت کرنے اور ہجرت، جہاد اور اسلامی ریاست کے قیام کے مختلف مراحل میں وہ مردوں کے دوش بدوش رہی۔ یہی کردار آج مسلمان عورت کو ادا کرنا چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ کار دعوت کی اہمیت اس کے ذہن نشین کرائی جائے، اس راہ میں قربانی کا جذبہ اس کے اندر پیدا کیا جائے۔ اسے بتایا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرماں برداری کا ایک بنیادی تقاضا امر بالمعروف ونہی عن المنکر بھی ہے۔ اس کی تکمیل مرد اور عورت کے تعاون ہی سے ہو سکتی ہے۔ معروف کے مٹنے اور منکر کے پھیلنے پر جو بے چینی ایک دیندار مرد میں ہونی چاہئے وہی ایک دین دار عورت میں ہونی چاہیے۔ اس کے ساتھ شرعی حدود کے اندر اسے ان تمام کاموں میں عملاً شریک کیا جائے جو اس فریضہ کی انجام دہی کے لیے ضروری ہیں۔

ادارہ تحقیق و تصنیف کی گرانقدر مطبوعات

قیمت	صفحات	مصنف	تصنیف
۲۵/=	۲۱۶	مولانا صدرالدین اصلاحی	معرکۂ اسلام و جاہلیت
۴۰/=	۳۸۸	مولانا سید جلال الدین عمری	صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات
۲۵/=	۱۷۶	"	اسلام میں خدمتِ خلق کا تصور
۳۵/=	۲۰۰	"	مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ
۸/=	۸۸	"	اسلام اور مشکلاتِ حیات
۱۰۰/=	۵۹۱	مولانا سلطان احمد اصلاحی	مذہب کا اسلامی تصور
۲۰/=	۱۰۲	"	مشترکہ خاندانی نظام اور اسلام
۳۰/=	۱۲۶	پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی	عہدِ نبوی کا نظامِ حکومت
۲۵/=	۲۸۰	الطاف احمد اعظمی علیگ	ایمان و عمل کا قرآنی تصور
۲۵/=	۲۰۰	ڈاکٹر عبید اللہ فراہی	تصوف ـ ایک تجزیاتی مطالعہ
۲۵/=	۲۴۷	ڈاکٹر رؤف اقبال	عہدِ نبوی کے غزوات و سرایا

ادارۂ تحقیق نے اپنی اردو اور انگریزی مطبوعات کے علاوہ دیگر اہم مکتبوں کی علمی و دینی کتب کی فراہمی کا بھی انتظام کیا ہے۔ فہرست کتب ایک خط لکھ کر طلب کی جا سکتی ہے

مکتبہ تحقیق و تصنیف اسلامی

پان والی کوٹھی۔ دودھ پور۔ علی گڑھ

تحقیق وتنقید

اسلامی ادبیات میں خضر کا تصوّر

(ایک تحقیقی جائزہ)

ڈاکٹر غلام قادر لون

تصوف کے ساتھ ساتھ عام اسلامی ادبیات میں حضرت خضر کا مسئلہ ایک دلچسپ مسئلہ ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں اس پر ایک تحقیقی جائزہ' پیشِ خدمت ہے۔ حضرت خضر کے نام و نسب کے بارے میں علماء سے دس سے زائد اقوال منقول ہیں[1] بعض علماء کا قول ہے کہ آپ حضرت آدم کے چوتھے فرزند تھے[2] ابو حاتم سجستانی (المتوفی ۲۵۵ھ/۸۶۴ء) کا بیان ہے کہ آپ کا نام خضرون بن قابیل بن آدمؑ ہے[3] بعض دوسرے علماء کے نزدیک آپ حضرت ابراہیمؑ پر ایمان لانے والے ایک شخص کی اولاد ہیں، آپ نے حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ مل کر بابل سے ہجرت کی تھی اور آپ کا نام بلیا بن ملکان بن فانع بن عامر بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح ہے[4]۔ وہب بن منبہ (۳۴-۱۱۴ھ/۶۵۴-۷۳۲ء) سے منسوب ایک قول میں آپ کا نام ایلیا بن

---

[1] ابن حجر عسقلانی۔ الاصابہ فی تمیز الصحابہ، تحقیق علی محمد البجاوی، القاہرہ ۱۳۸۳ھ/۱۹۷۰ء ۲: ۲۸۶ - ۲۸۷ ابن کثیر۔ البدایہ والنہایہ، مکتبہ المعارف بیروت الطبعۃ الثانیہ ۱۹۷۷ء ۱: ۳۲۶۔ شیخ حسین ابن محمد بن الحسن الدیار البکری۔ تاریخ الخمیس، مصر الطبعۃ الاولیٰ ۱۳۰۲ھ ۱: ۱۲۰

[2] البدایہ والنہایہ ۱: ۳۲۶، ابن کثیر۔ قصص الانبیاء تحقیق الدکتور مصطفیٰ عبد الواحد، الطبعۃ الثالثۃ ۱۴۰۸ھ۔ ۱۹۸۸ء ۲: ۵۱۸۔

[3] ابو حاتم سہل السجستانی۔ کتاب المعمرین مرتبہ اگناز گولڈزیہر۔ بریل لیڈن ۱۸۹۹ء ص ۱، البدایہ والنہایہ ۱: ۳۲۶، تاریخ الخمیس ۱: ۱۲۱، تاریخ الخمیس اور بعض دوسری کتابوں میں بلیا کی جگہ بلیان بھی آیا ہے۔

[4] ابو جعفر محمد بن جریر الطبری۔ تاریخ الطبری، دار الکتب العلمیہ بیروت لبنان الطبعۃ الثانیہ ۱۴۰۸ھ/۱۹۸۸ء ۱: ۲۲۰ - ابن اثیر۔ الکامل فی التاریخ۔ دار الفکر بیروت ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء ۱: ۱۶۰۔ البدایہ والنہایہ ۱: ۳۲۶۔ یہ قول وہب بن منبہ کا ہے امام نودی نے ملکان کے علاوہ کلمان بھی دیا ہے۔ دیکھئے ابو زکریا محی الدین یحییٰ بن شرف الدین النووی۔ تہذیب الاسماء واللغات دار الکتب العلمیہ بیروت لبنان (بدون سن طباعت)

عامیل بن شمالخیین بن ارمابن علقمابن عیصوبن اسحاق بن ابراہیمؑ بتایا گیا ہے[۱] ایک اور قول میں آپ کا نام ارمیابن حلقیا آیا ہے حلقیا آیا ہے حلقیا حضرت ہارون کی اولاد میں سے تھے[۲] مراۃ الاسرار کے مصنف کے بیان کے مطابق آپ کا نام خضر بن ملکان بن عیان بن طیان بن سمعان بن سام بن نوح ہے[۳] مولانا یعقوب چرخی (المتوفی ۸۵۱ھ/۱۴۴۷ء) کے بقول آپ کا نام ملکان بن بلیان بن سمعان بن سام بن نوح ہے[۴] علاوہ ازیں حضرت خضر کے نام ونسب کے بارے میں علماء سے دوسرے اقوال بھی منقول ہیں مگر ان میں سے اکثر اقوال پر جرح کی گئی ہے[۵]

اہل تورات اور کتب سابقہ کے مطابق حضرت خضر کا نام خضر بن ملکان بن قانع بن عابور بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح ہے۔ اہل کتاب ہی کے ایک دوسرے قول میں آپ کا نام خضرون بن عمائیل بن النصر بن العیص بن اسحاق بن ابراہیم نقل کیا گیا ہے[۶]

صحیح اور مشہور قول یہ ہے کہ آپ کا اصلی نام بلیا بن ملکان بن فانع بن شالخ بن عامر ارفخشد بن سام بن نوح ہے[۷] یہ قول وہب بن منبہ کا ہے جو کتب سابقہ کے ثقہ عالم تھے۔ اسی قول کو ابن قتیبہ الدینوری (۲۱۳ – ۲۷۶ھ/۸۲۸ – ۸۸۹ء) اور امام نووی (۶۳۱ – ۶۷۶ھ/۱۲۳۳ – ۱۲۷۷ء) نے اختیار کیا ہے[۸] قدرے تغیر کے ساتھ تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں اس قول کو بکثرت نقل کیا گیا ہے۔

۱۔ شیخ کمال الدین الدمیری۔ حیاۃ الحیوان الکبریٰ مطبعۃ السعادہ مصر ۱۳۳۰ھ ۱: ۴۸۳

۲۔ حیاۃ الحیوان الکبریٰ ۱: ۴۸۳، البدایہ والنہایہ ۱: ۳۲۶، ابن حجر عسقلانی۔ الزہر النضر فی حال الخضر۔ تقدیم وتحقیق وتخریج نصوص صلاح الدین مقبول احمد، مجمع البحوث الاسلامیہ نیو دہلی (الہند) الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۰۸ھ/۱۹۸۸ء ص ۶۱

۳۔ عبدالرحمن چشتی۔ مراۃ الاسرار عکسی مخطوطہ کتب خانہ شبلی نعمانی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ۱: ۳۵

۴۔ مولانا یعقوب چرخی۔ رسالۂ ابدالیہ تصحیح وتعلیق وپیش گفتار از محمد نذیر رانجھا، مرکز تحقیقات فارسی ایران وپاکستان اسلام آباد ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء فصل ۱۰ ص ۳۰

۵۔ الاصابہ ۲: ۲۸۶ – ۲۸۷، الزہر النضر فی حال الخضر ص ص ۵۸ – ۶۳

۶۔ ابوالحسن علی بن الحسین المسعودی۔ مروج الذہب ومعادن الجواہر، المطبعۃ الازہریہ المصریۃ الطبعۃ الاولیٰ ۱۳۰۳ھ ۱: ۲۰ – ۲۱

۷۔ حیاۃ الحیوان الکبریٰ ۱: ۴۸۳، ایک قول میں ایلیا بھی منقول ہے۔ دیکھئے، البدایہ والنہایہ ۱: ۳۲۶

۸۔ ابومحمد عبداللہ بن مسلم ابن قتیبہ الکاتب الدینوری۔ کتاب المعارف مرتبہ فرڈیننڈ وسٹنفلڈ گوتنجن ۱۸۵۰ء ص ۲۱ تہذیب الاسماء واللغات ۱: ۱۷۶

امام نووی کا بیان ہے کہ آپ کی کنیت ابوالعباس ہے[۱] اور اس پر سب کا اتفاق ہے[۲] مورخین اور صوفیہ نے ان کی کنیت یہی بتائی ہے[۳]

اکثر مورخین کے نزدیک خضر آپ کا لقب ہے[۴] صحیح بخاری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے کہ آپ کا نام اس وجہ سے خضر پڑ گیا کہ آپ سوکھی زمین پر بیٹھ گئے تو وہ سرسبز ہوگئی[۵] ایک دوسرے قول میں بتایا گیا ہے کہ آپ جہاں قیام کرتے ہیں وہاں سرسبز گھاس اگتی ہے یا وہاں کی خشک گھاس سرسبز ہو جاتی ہے، ایک اور قول میں خضر کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ آپ جہاں نماز پڑھتے ہیں وہاں کے اردگرد کی زمین سبزہ زار بن جاتی ہے۔ ان میں پہلا قول صحیح ہے کیونکہ یہ ارشاد نبوی ہے اور علماء کی اکثریت نے اسی کو اختیار کیا ہے[۶] حضرت موسیٰؑ نے آپ کو سبز بچھونے پر کپڑا اوڑھے ہوئے لیٹے ہوئے دیکھا تھا[۷]

حضرت خضر کے والدین میں سے ایک فارسی اور دوسرے رومی ہیں[۸] حضرت سعید بن مسیب (المتوفی ۹۴ھ/۷۱۲ء) کا بیان ہے کہ حضرت خضر کی ماں رومی اور باپ فارسی ہیں[۹] علماء کی اکثریت کا خیال ہے کہ آپ فارس سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک بیان کے مطابق آپ فارس میں شیراز سے دو فرسخ دور ایک مقام پر پیدا ہوئے ہیں[۱۰]

---

۱ تہذیب الاسماء واللغات ۱:۱۷۶، یہی قول ابن قتیبہ نے نقل کیا ہے۔ دیکھئے کتاب المعارف ص۲۱

۲ الاصابہ ۲:۲۸۸، الزہر النضر فی حال الخضر ص۶۵

۳ البدایہ والنہایہ ۱:۳۲۷۔ تاریخ الخمیس ۱:۱۲۱، حیاۃ الحیوان الکبری ۱:۴۸۴، مراۃ الاسرار ۱:۳۵

۴ تہذیب الاسماء واللغات ۱:۱۷۶، البدایہ والنہایہ ۱:۳۲۷، حیاۃ الحیوان الکبری ۱:۴۸۴

۵ امام بخاری ۔ صحیح البخاری، دار احیاء التراث العربی القاہرہ ۱۳۷۸ھ/۱۹۵۸ء، کتاب الانبیاء، باب حدیث الخضر مع موسیٰ، الجزء الرابع ص۱۹۰

۶ البدایہ والنہایہ ۱:۳۲۷، تہذیب الاسماء واللغات ۱:۱۷۶، حیاۃ الحیوان الکبری ۱:۴۸۴، الاصابہ ۲:۲۸۷، مراۃ الاسرار ۱:۳۵۔

۷ البدایہ والنہایہ ۱:۳۲۷، قصص الانبیاء ۲:۵۲۲ ۸ الاصابہ ۲:۲۸۷

۹ الاصابہ ۲:۲۸۷، قصص الانبیاء ۲:۵۲۰ ۱۰ مراۃ الاسرار ۱:۳۵

بعض علماء کی رائے ہے کہ حضرت خضر مشہور پیغمبر حضرت الیاس کے بھائی ہیں۔ ان کے باپ بادشاہ تھے۔ امور سلطنت سے دلچسپی پیدا کرنے کی غرض سے بادشاہ نے حضرت خضر کی دو شادیاں کیں لیکن وہ گھر سے بھاگ گئے[1] ایک دوسرے بیان کے مطابق حضرت خضر کی پرورش بیابان میں ہوئی ہے۔ آپ قریبی بستی کے ایک شخص کے ریوڑ کی بکری کا دودھ پیتے تھے۔ ریوڑ کے مالک نے ان کی پرورش کی۔ جب جوان ہوئے تو ان کے باپ کو جو بادشاہ تھے صحف ابراہیم کی کتابت کے لیے کاتبوں کی ضرورت پڑی۔ حضرت خضر بھی گئے کچھ وقت بعد بادشاہ نے انھیں پہچان لیا[2]

تاریخی لحاظ سے حضرت خضر کے زمانہ کا تعین کرنا قدرے دشوار ہے۔ ایک قول میں کہا گیا ہے کہ حضرت خضر ایران کے بادشاہ افریدون اور ذوالقرنین کے ہم عصر رہے ہیں[3] حضرت خضر کے ساتھ اکثر ذوالقرنین یا اسکندر کا نام آتا ہے۔ چونکہ عام طور پر اسکندر ہی کو ذوالقرنین سمجھا جاتا ہے اس لیے حضرت خضر کے ساتھ اسکندر کا نام جوڑ دیا گیا حالانکہ مورخین کا بیان ہے کہ ذوالقرنین دو گذرے ہیں۔ ایک کو ذوالقرنین اکبر اور دوسرے کو ذوالقرنین اصغر کہتے ہیں۔ قرآن میں جس ذوالقرنین کا ذکر آیا ہے وہ ذوالقرنین اکبر تھے۔ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں تھے[4] حضرت ابراہیم نے چاہ سبع کھودا تو اردن کی ایک جماعت نے زمین کا دعویٰ کیا۔ حضرت ابراہیم ذوالقرنین کے پاس مقدمہ لے گئے۔ بادشاہ نے ان کے حق میں فیصلہ دیا[5] چونکہ حضرت ابراہیم کے معاصر بادشاہ ایران کے حکمراں فریدون بن اثغیان ہی ہیں اس لیے بعض مورخین کی رائے یہ ہے کہ ذوالقرنین اکبر فریدون بن اثغیان ہی ہیں[6] تاریخ الخمیس کے مطابق ذوالقرنین سام بن نوح کی اولاد میں سے تھے۔ ان سے

---

[1] البدایہ والنہایہ ۱: ۳۳۰۔ قصص الانبیاء ۲: ۵۲۰

[2] حیاۃ الحیوان الکبریٰ ۱: ۴۸۴

[3] تاریخ الطبری ۱: ۲۲۰، الکامل فی التاریخ ۱: ۱۶۰، تاریخ الخمیس ۱: ۱۲۱

[4] تاریخ الطبری ۱: ۲۲۰، الکامل فی التاریخ ۱: ۱۶۰، تاریخ الخمیس ۱: ۱۲۱

[5] ابو اسحاق احمد بن ابراہیم الثعلبی۔ قصص الانبیاء المسمی بالعرائس، اسکندریہ ۱۲۸۲ھ ص ۲۴۰

[6] تاریخ الطبری ۱: ۲۲۰، الکامل فی التاریخ ۱: ۱۶۰

حضرت ابراہیم کی ملاقات ہوئی ہے۔ اسی ذوالقرنین نے یاجوج وماجوج کے مقابلہ میں دیوار کھڑی کی اور اسکندریہ کا شہر بسایا۔ حضرت ابن عباس کے بقول اس کا نام عبداللہ بن ضحاک تھا[1] تاریخ الخمیس ہی میں سکندر یونانی (۳۵۶ - ۳۲۴ ق م) کا ذکر ذوالقرنین اصغر کی حیثیت سے کیا گیا ہے[2] اس لیے سکندر وہ ذوالقرنین نہیں ہیں جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔

عام مورخین اور علماء کی رائے ہے کہ حضرت خضر ذوالقرنین کے خالہ زاد بھائی ہیں[3] اور وہ ان کے وزیر اور فوج میں اگلے دستہ کے سردار تھے[4] یہیں سے آب حیات کی روایت جنم لیتی ہے جس نے حضرت خضر ہی کو نہیں پورے معاملہ کو بقائے دوام عطا کیا ہے۔ حضرت امام جعفر صادق سے مروی ایک روایت کے مطابق ذوالقرنین کو ایک فرشتہ رفائیل سے ظلمات میں واقع آب حیات کے چشمے کے بارے میں پتہ چلا۔ اس نے علماء کو جمع کرکے ان سے ظلمات کے بارے میں استفسار کیا۔ ایک عالم نے بتایا کہ میں نے حضرت آدم کی وصیت میں پڑھا ہے کہ ظلمات سورج کے طلوع ہونے کی جگہ واقع ہے۔ ذوالقرنین فوج لے کر جگہ کی تلاش میں نکلا۔ بارہ سال سفر کرنے کے بعد وہ ایک تاریک مقام کے کنارے پہنچا۔ علماء اور فوج نے اسے آگے جانے سے منع کیا مگر اس نے فوج میں چھ ہزار آدمیوں کو منتخب کرکے آگے بڑھنے کا قصد کیا۔ حضرت خضر کو دو ہزار آدمیوں پر مشتمل مقدمہ کا سردار بنا کر آگے کیا۔ حضرت خضر ایک وادی تک پہنچ گئے۔ وادی کے بالائی حصے پر پہنچ کر انھوں نے اپنے ساتھیوں کو روکا اور تن تنہا خود آگے بڑھے۔ چلتے چلتے ایک چشمہ کے کنارے پہنچے جس کا پانی سفید اور شیریں تھا۔ انھوں نے پانی پیا اور وضو اور غسل کرکے چلے آئے۔ ذوالقرنین وہاں پہنچا تو اسے وہ چشمہ نہ ملا[5] بعض روایات کے مطابق ذوالقرنین کو آب حیات کے متعلق معلومات ایک کتاب یا حضرت آدم کے

۱؎ تاریخ الخمیس ۱ : ۱۱۵

۲؎ تاریخ الخمیس ۱ : ۱۱۵

۳؎ تاریخ الخمیس ۱ : ۱۱۴، مراۃ الاسرار ۱ : ۳۶

۴؎ تاریخ الخمیس ۱ : ۱۱۴، ۱۱۵

۵؎ الاصابہ ۲ : ۲۹۱ - ۲۹۳، البدایہ والنہایہ ۲ : ۱۰۷، قصص الانبیاء المسمی بالعرائس ص ص ۳۹۸ — ۴۰۰۔

وصیت نامہ سے معلوم ہوئی تھیں[۱]۔

چشمۂ حیوان، آبِ حیات اور حیات جاوداں کا تصور ادبیاتِ مشرق و مغرب کا دلچسپ موضوع رہا ہے، سریانی، کلدانی، یونانی، عبرانی، عربی، فارسی، اردو، لاطینی، انگریزی، فرانسیسی اور دوسری زبانوں میں کسی نہ کسی شکل میں آبِ حیات کا تصور موجود ہے۔ اسلام سے پہلے اہلِ بابل، یہودی اور یونانی خاص طور پر ایسی روایات سے واقف رہے ہیں جن میں آبِ حیات یا آبِ بقا کا بیان ملتا ہے۔

بابل، مصر، یونان اور ایران کی قدیم تاریخ کے واقعات اکثر مشترک ہیں۔ اس لیے کسی قوم کی تاریخ بیان کرتے وقت دوسری قوموں کا ذکر ناگزیر ہوتا ہے۔ فارسی کے مشہور شاعر فردوسی (۳۲۰ – ۴۱۱ھ / ۹۳۲ – ۱۰۲۰ء) نے جب اہل ایران کی تاریخ "شاہ نامہ" میں نظم کی تو سکندر کی فتوحات کا بھی بالتفصیل ذکر کیا۔ سکندر کی تاریخ بیان کرتے ہوئے مصنف نے شاہ نامہ میں "رفتن اسکندر بتاریکی بجستن آبِ حیات" کے عنوان کے تحت سکندر کے ناکام و نامراد سفرِ ظلمات کی داستان بھی بیان کی ہے[۲]۔ ان کے بعد مشہور صوفی شاعر نظامی گنجوی (۵۳۳ – ۵۹۶ھ / ۱۱۳۸ – ۱۱۹۹ء) نے اسرائیلی، یونانی اور ایرانی روایات کو ملا کر یونان کے عظیم الشان فاتح کی منظوم تاریخ "سکندر نامہ" کے نام سے نظم کی۔ فردوسی کی طرح نظامی گنجوی نے بھی سکندر کو ذوالقرنین سمجھا ہے۔ چنانچہ انھوں نے سکندر نامہ میں سکندر کو ایک دین دار، صاحبِ فہم و فراست، عالم و فاضل اور حلیم و بردبار بادشاہ کے روپ میں پیش کیا ہے۔ سکندر نامہ برّی میں انھوں نے "رفتن سکندر بتلاش آبِ حیات" کے عنوان کے تحت سکندر کے سفرِ ظلمات کی داستان تفصیل سے بیان کی ہے[۳]۔ فردوسی اور نظامی دونوں نے بیان کیا ہے کہ سکندر نے حضرت خضر کو فوج کے مقدمہ کا سردار بنایا۔ حضرت خضر چشمۂ حیوان پر پہنچے اور

۱۔ تاریخ الخمیس ۱: ۱۱۴، قصص الانبیاء المسمی بالعرائس ص۲۰۱، ابو حاتم سجستانی کا بیان ہے کہ حضرت خضر کو ابدی زندگی اس عمل کی وجہ سے ملی کہ انھوں نے طوفان نوح کے بعد حضرت آدم کی نعش دفن کی تھی۔ دیکھیے کتاب المعمرین ص۱، البدایہ والنہایہ ۱: ۳۲۶، قصص الانبیاء ۲: ۵۱۸ – ۵۱۹

۲۔ حکیم ابو القاسم فردوسی طوسی۔ شاہ نامہ مطبع فتح الکریم بمبئی ۱۳۰۶ھ ۳: ۷۳

۳۔ نظامی گنجوی۔ سکندر نامہ برّی مطبع منشی گلاب سنگھ (بدون سن طباعت) ص ص ۵۱۳ – ۵۳۸۔

انھوں نے پانی پی لیا جس سے ان کو حیات جاوداں ملی۔ سکندر چشمہ تک نہ پہنچا اور آب حیات سے محروم رہا[1]

شاہ نامہ یا سکندر نامہ میں آب حیات کا بیان محض فردوسی یا نظامی کی خیال آفرینی نہیں ہے بلکہ یونانی زبان کے ایک گم نام مصنف نے سکندر کی داستان ۳۰۰ق م میں لکھی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ سکندر ابدی زندگی پانے کے لیے آب حیات کی تلاش میں نکلا اس کے ساتھ اس کا باورچی Andreas بھی تھا۔ باورچی دوران سفر ایک چشمہ پر پہنچ گیا اور کھانا بنانے لگا۔ اس نے اپنے ساتھ نمک دی ہوئی ایک خشک مچھلی بھی لی تھی، وہ مچھلی کو پانی سے صاف کرنے لگا تو وہ زندہ ہوگئی۔ باورچی نے اس چشمہ سے پانی پی لیا تو اس نے بھی ہمیشہ کے لیے زندگی پائی۔ سکندر نے چشمہ کو بہت تلاش کیا مگر اسے چشمہ نہ ملا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ باورچی نے اس چشمے کا پانی پی لیا ہے تو اس کے دل میں حسد پیدا ہوا۔ اس نے باورچی کو قتل کرنے کا ارادہ کیا مگر وہ اس کے قتل پر قادر نہ ہوسکا۔ آخر میں اس نے باورچی کی گردن میں پتھر باندھ کر دریا میں پھینک دیا جہاں اس نے سمندر دیوتا Sea Demon کی صورت اختیار کی[2] نظامی نے لکھا ہے کہ "رومیان کہن" کی اس داستان میں حضرت خضر کے ساتھ حضرت الیاس کا نام بھی آیا ہے اور انھوں نے بھی حضرت خضر کے ساتھ پانی پی کر ابدی زندگی پائی ہے[3] سکندر نامہ میں "رومیان کہن" کی ترکیب سے یونانیوں کے اسی قصہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

حیات جاوداں کا تصور اہل بابل کے یہاں بھی موجود رہا ہے۔ کھدائی کے دوران برآمد ہونے والے کتبات سے طوفان نوح کے بارے میں جو نئی معلومات سامنے آئی ہیں ان میں بارہ الواح پر مشتمل ایک لمبی داستان بھی ہے جس کا ہیرو ارک کا بادشاہ جل جمش (Gilgames) ہے ان قدیم کتبات میں درج بعض بیانات کا زمانہ تقریباً ۲۰۰۰

---

[1] شاہ نامہ ۳: ۷۳، سکندر نامہ ص ص ۵۱۳ - ۵۳۸

[2] Encyclopaedia of Religion and Ethics, 1914, art. "Khidr" By I. Friedlaender, vol. VIII P.P. 693 - 694

[3] سکندر نامہ بری ص ص ۵۲۶ - ۵۲۸

سے ۱۵۰۰ اق م بتایا جاتا ہے[1] طویل داستان میں جل جمش طوفان عالمگیر (طوفان نوح کے ہیرو اتنا پشتیم (حضرت نوح کی طرف اشارہ ہے) کے پاس جاتا ہے تاکہ وہ اس بزرگ اور عقل کل سے جو اطاعت الٰہی کی بنا پر ابدی زندگی پا چکا ہے اپنے مردہ دوست ابانی کو زندہ کرنے کے لیے کوئی رہنمائی حاصل کر سکے۔ اتنا پشتیم کو تلاش کرنے کے لیے جل جمش دریاؤں کے دہانے کی کھوج لگانے کے لیے سفر کرتا ہے۔ دشوارگزار راستہ طے کرنے کے بعد وہ مشو کے تاریک پہاڑ (کوہ ظلمات) تک پہنچ جاتا ہے۔ پہاڑ کے دوسری طرف اس نے دیوی سیتو کو پردہ اوڑھے ہوئے سمندر کے تخت (ممکن ہے جزیرۃ البحر مراد ہو) پر براجمان پاتا ہے جو اتنا پشتیم تک رسائی کے لیے جل جمش کو موت کا سمندر پار کرنے کے لیے ہمسایہ ملاح سے مدد لینے کی ہدایت کرتی ہے۔ اتنا پشتیم کے پاس پہنچ کر جل جمش کو وہ طوفان کی تمام تفصیلات سے آگاہ کرتے ہیں۔ اتنا پشتیم اسے ایک جڑی کا پتہ دیتے ہیں جس کو کھا کر انسان کی جوانی لوٹ آتی ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے زندہ رہتا ہے جل جمش واپس ہوتا ہے تو ملاح اسے پانی سے نہلواتا ہے جہاں اسے جڑی مل جاتی ہے لیکن راستے ہی میں ایک سانپ اس سے جڑی چھین لیتا ہے۔ مایوس ہو کر وہ لوٹنے کے بعد شہر ارک کی دیواروں کی تعمیر کا کام دوبارہ شروع کرتا ہے[2] ماہرین اثریات وحفریات کے دریافت کردہ کتبوں سے طوفان نوح کے بارے میں دلچسپ معلومات ملی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ طوفان نوح ایک تاریخی صداقت ہے۔ جل جمش کی نظم میں واقعہ کی جو تصویر پیش کی گئی وہ قرآن اور احادیث سے حیرت انگیز مماثلت رکھتی ہے۔ مثلاً اس میں کہا گیا ہے کہ دیوتا علاقہ میں پھیلی ہوئی برائیوں سے ناراض ہوئے اور انھوں نے آبادی

---

[1] Encyclopaedia of Religion and Ethies, London 1930, art; "Babyloucians and Assyrians" By H. Zimmern vol. II. P. 314

[2] Encyclopaidia of Religion and Ethies New york 1913 art; Heroes and Hero-gods (Babyloniam) By T.G. Pinches vol VI P. 643

Encyclopaidia of Religion and Ethics New york 1930 art. Babylonians and assyrians by H. Zimmern vol. II pp 315.316

کو تباہ کرنے کا ارادہ کیا تباہی سے پہلے انھوں نے زیوسدرنامی اطاعت گزار شخص (اتناپشتیم) کو ایک کشتی بنانے کا حکم دیا اس نے کشتی تیار کی اور مال واسباب اور اپنے آدمیوں اور جانوروں کو اس پرسوار کرلیا۔ اس کے بعد چھ دنوں اور چھ راتوں تک مسلسل بارش ہوتی رہی۔ ساری زمین غرقاب ہوگئی۔ کشتی کوہ نصیریہ سے جالگی۔ ساتویں روز بارش تھم گئی تو اتناپشتیم نے کشتی سے ایک فاختہ اڑائی جو واپس آگئی جس سے اندازہ ہوا کہ پانی ابھی نہیں اترا ہے اس کے بعد کوے کو اڑایا گیا وہ واپس نہیں آیا[۱] طوفان کے بارے میں اس قسم کی تفصیلات ہماری روایات سے بہت حد تک ملتی جلتی ہیں۔ اگرچہ دونوں میں بعض اختلافات بھی موجود ہیں۔

بنی اسرائیل کے یہاں بھی ابدی زندگی کا تصور پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ان کے یہاں ایلیاہ نبی جنھیں مسلمان حضرت الیاس علیہ السلام کہتے ہیں کے متعلق مشہور ہے کہ وہ زندہ ہیں ایلیاہ نبی یا حضرت الیاس بنی اسرائیل کے بادشاہ اخاب بن عمری جو بائیس برس بنی اسرائیل کا حکمران رہا ہے۔ کے زمانے میں مبعوث ہوئے۔ اخاب کا زمانہ قریباً ۸۷۵ ق م تا ۸۵۳ ق م مانا جاتا ہے[۲] اس کے زمانہ میں بنی اسرائیل میں بعل کی پرستش شروع ہوگئی۔ ان کی ہدایت کے لیے۔ اللہ تعالیٰ نے جلعاد کے ایک باشندہ ایلیا تشبی کو مبعوث کیا[۳] ایلیا نے بعل پرستی کے خلاف تبلیغ کی۔ کوہ کرمل پر انھوں نے بنی اسرائیل کے لوگوں اور بعل دیوتا کے ساڑھے چار سو اور یسیرت مندر کے چار سو کاہنوں کو جمع کرواکر مخاطب کیا" تم کب تک دو خیالوں میں ڈانوا ڈول رہو گے اگر خداوند ہی خدا ہے تو اس کے پیرو ہو جاؤ اگر بعل ہے تو اس کی پیروی کرو[۴] تورات میں حضرت الیاس کے اس بیان کو قرآن نے مؤثر اور بلیغ انداز میں

---

[۱] مورس بوکائیے۔ بائبل قرآن اور سائنس اردو ترجمہ از ثناء الحق صدیقی، دہلی اشاعت سوم ۱۹۸۸ء حواشی صفحات ۲۸۵ تا ۲۸۷ میں فاضل مترجم نے سر یونارڈ ووے کی کتاب "Excavations at ur" سے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ تاہم اردو میں ابھی تک حفریاتی شہادتوں سے استشہاد کرنے کا ذوق نایاب نہ سہی کمیاب ضرور ہے۔ موجودہ دور میں اس کی زیادہ ضرورت ہے کہ مذہب کی ترجمانی میں جملہ دستیاب شواہد کو کام میں لاکر اپنی بات کو باوزن بنایا جائے۔

[۲] Encyclopaedia Biblica- A dictionary of Bible, Edited by. T.K. Cheyne and J. Sutherland Black London 1914 P.1270

[۳] تورات کتاب سلاطین اباب ۱۶ ۲۹-۳۴، باب ۱۷: ۱ [۴] تورات۔ کتاب سلاطین اباب ۱۸ : ۲۱

یوں ادا کیا ہے:

اِذْ قَالَ لِقَوْمِہٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَ ○	جبکہ انھوں نے (الیاسؑ) اپنی قوم سے
اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّ تَذَرُوْنَ اَحْسَنَ	فرمایا: کیا تم نہیں ڈرتے تم بعل کو پوجتے ہو اور اس کو
الْخَالِقِیْنَ ○ اللّٰہَ رَبَّکُمْ	چھوڑ بیٹھے ہو جو سب سے بڑھ کر بنانے والا ہے
وَرَبَّ اٰبَآئِکُمُ الْاَوَّلِیْنَ ○	اس اللہ کو جو تمہارا اور تمہارے اگلے پچھلے
(الصّٰفّٰت: ۱۲۴-۱۲۵)	باپ داداؤں کا رب ہے۔

بادشاہ اخاب اور ایلیاہ نبی کے درمیان ہوئے مکالمے اور بعل پرستی کے خلاف ان کی تبلیغ کا حال بنی اسرائیل کی تاریخ میں مفصل طور پر بیان کیا گیا ہے[1] ایلیاہ نبی کے بارے میں یہودیوں میں ایسی روایات ملتی ہیں جو ہمارے یہاں حضرت خضر یا حضرت الیاس کے بارے میں مشہور ہیں[2] یہی وجہ ہے کہ فریڈلینڈر (Friedlaender) نے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے خضر کا تصور یہودیوں سے اخذ کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہودیوں کے معتقدات اور مسلمانوں کی روایات میں فرق ہے۔ بابل اور سیمریائی کتبات سے بھی مسلمانوں کی روایات کی تائید ہوتی ہے۔

حیات ابدی کا تصور اگرچہ چاروں قوموں میں موجود ہے لیکن آب حیات کی روایت صرف یونانیوں اور مسلمانوں کے یہاں ملتی ہے۔ اہل بابل میں اگرچہ سمندر اور پانی کا ذکر ملتا ہے مگر حیات ابدی کا سبب اس جڑی کو بتایا گیا ہے جو جلجمش کو پانی میں ملی تھی۔

قرآن حکیم میں حضرت خضر کی ابدی زندگی کے متعلق کوئی تصریح نہیں ہے، البتہ ایک صالح بندے کے بارے میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ایک مخصوص علم سے نوازا ہے چنانچہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کے پاس جانے کا حکم ملا۔ تو حضرت موسیٰؑ نے ان کے پاس جاکر اس علم میں سے کچھ حصہ سکھلانے کی درخواست کی انھوں نے جواب

---

[1] Flavius Josephus, Antiquities of Jews, (Translated By William Whiston) London Book VIII Chap XIII PP. 243-247

[2] The Jewish Encyclopaedia, New york London 1916. art "Elijah" vol V. 122-124.

دیا کہ آپ سے میرے افعال پر صبر نہ ہو سکے گا۔ حضرت موسیٰ نے ساتھ نباہنے کا عزم ظاہر کیا لیکن جب اس صالح بندے نے اسی علم کی رہنمائی میں غریب ملاح کی سالم کشتی کا تختہ نکالا، ایک معصوم جان کو قتل کیا اور بغیر اجرت کے دیوار کھڑی کر دی تو حضرت موسیٰ ان تینوں چیزوں کی توجیہ نہ کر پائے اور اعتراض کیا۔ آخر میں ان تینوں چیزوں کی توجیہات بتا کر صالح بندے نے آپ کو رخصت کر دیا[1] قرآن حکیم میں اس صالح بندے کا نام مذکور نہیں ہے مگر احادیث صحیحہ میں ان کا نام خضر آیا ہے، حضرت خضر اور حضرت موسیٰ کی ملاقات کی تفصیلات صحیح احادیث میں منقول ہیں[2]۔

حضرت خضر علیہ السلام کی نبوت، رسالت، ولایت اور حیات ہونے کے بارے میں علماء اسلام کے یہاں اختلاف موجود ہے۔ صوفیاء کے ایک طبقہ کا خیال ہے کہ حضرت خضر ولی ہیں[3]۔ امام قشیری (۳۷۶–۴۶۵ھ / ۹۸۶–۱۰۷۲ء) کہتے ہیں کہ حضرت خضر نبی نہیں ولی ہیں[4] امام ماوردی (المتوفی ۴۵۰ھ) کا بیان ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت خضر نبی ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں ولی ہیں اور ایک رائے یہ ہے کہ وہ فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہیں جو آدمیوں کی صورت اختیار کرتے ہیں[5] لیکن امام نووی کے نزدیک آخری قول جس میں حضرت خضر کو فرشتہ کہا گیا ہے غریب، ضعیف یا باطل ہے[6] ابوالخطاب بن دحیہ (۵۴۴–۶۳۳ھ / ۱۱۴۹–۱۲۳۵ء) کا قول ہے کہ ہم نہیں جانتے وہ فرشتہ ہیں یا نبی یا بندۂ صالح ہیں[7]۔ اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ حضرت خضر نبی ہیں۔ امام ثعلبی (المتوفی ۴۲۷ھ / ۱۰۳۵ء) کا کہنا ہے کہ تمام اقوال میں خضر معمر نبی ہیں بلکہ بعض علماء کا قول ہے کہ حضرت خضر کی نبوت کا اعتقاد زندقہ کے عقدہ کا پہلا حل ہے کیونکہ زنادقہ ان کے غیر نبی ہونے کو اس خیال کا ذریعہ بناتے

---

[1] سورۃ الکہف : ۶۰–۸۲

[2] صحیح البخاری۔ کتاب العلم، باب مایستحب للعالم اذا سئل ای الناس اعلم، الجزء الاول ص ص ۴۱–۴۲، کتاب التفسیر سورۃ الکہف، الجزء السادس ص ص ۱۱۰–۱۱۷، صحیح مسلم، کتاب الفضائل، فضائل الخضر۔

[3] الاصابہ ۲ : ۲۸۹ [4] الاصابہ ۲ : ۲۸۹

[5] الاصابہ ۲ : ۲۸۹، تہذیب الاسماء واللغات ۱ : ۱۷۷، حیاۃ الحیوان الکبریٰ ۱ : ۳۸۵

[6] تہذیب الاسماء واللغات ۱ : ۱۷۷، صحیح مسلم بشرح نووی، کتاب الفضائل، فضائل الخضر، حیاۃ الحیوان الکبریٰ ۱ : ۳۸۵

[7] الاصابہ ۲ : ۲۸۹

ہیں کہ ولی نبی سے افضل ہوتا ہے جیسا کہ ان میں سے کسی کہنے والے نے کہا ہے۔

مقام النبوۃ فی برزخ ۔۔۔۔۔ فویق الرسول و دون الولی[1]

امام نووی نے ان لوگوں کے قول کو ترجیح دی ہے جو کہتے ہیں کہ حضرت خضر نبی ہیں[2]۔ ابن کثیر (۷۰۱ – ۷۷۴ھ / ۱۳۰۱ – ۱۳۷۲ء) نے خضرؑ کی نبوت پر سورۃ کہف سے چار دلیلیں فراہم کی ہیں[3]۔ بعض علمار کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خضر کی زبانی فرمایا "وما فعلتہ عن امری" اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے یہ کام بہ حکم خدا انجام دیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان پر وحی ازی تھی۔ اسی وحی کے مطابق انھوں نے ایک لڑکے کو قتل کیا۔ اگر غیر نبی ہوتے تو انسان کو قتل کرنے کے لیے وحی یا الہام پر عمل کرنا ان کے لیے ضروری نہ تھا اس لیے ان کی نبوت کا انکار ممکن نہیں اور انکار کیسے ممکن ہو اس سے غیر نبی کا نبی سے زیادہ عالم ہونا لازم آئے گا۔ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ سے کہا "بلی عبدنا خضر" نیز نبی غیر نبی کا تابع کس طرح ہو سکتا ہے۔ امام ابن حجر عسقلانی (۷۷۳ – ۸۵۲ھ / ۱۳۷۱ – ۱۴۴۸ء) نے اسی لیے کہا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ان کی جو باتیں ہوئیں وہ زیادہ تر اس شخص کے قول کی درستی پر دلالت کرتی ہیں جو یہ کہتا ہے کہ وہ نبی تھے[4]۔ مفسرین میں ابوحیان کہتے ہیں کہ جمہور کی رائے یہ ہے کہ وہ نبی ہیں[5]۔ امام زمخشری (۴۶۸ – ۵۳۸ھ / ۱۰۷۵ – ۱۱۴۳ء) بھی اسی رائے کے قائل ہیں[6]۔ قرطبی (المتوفی ۶۷۱ھ / ۱۲۷۲ء) اور علامہ آلوسی (المتوفی ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۴ء) بھی ان کی نبوت کے قائل ہیں[7]۔ صحیح رائے یہی معلوم ہوتی ہے کہ حضرت خضر نبی تھے البتہ حضرت عبداللہ بن عباس (۳ق ھ – ۶۸ھ / ۶۲۰ – ۶۸۷ء) اور وہب بن منبہ کا قول ہے کہ وہ غیر مرسل نبی تھے[8]

خضر کی حیات کا مسئلہ بھی متنازعہ رہا ہے۔ محدثین کا ایک طبقہ ان کے حیات ہونے

---

[1] الاصابہ ۲: ۲۸۸ [2] تہذیب الاسماء واللغات ۱: ۱۷۷

[3] قصص الانبیاء ۲: ۵۲۲ – ۵۲۳، البدایہ والنہایہ ۱: ۳۲۸

[4] الاصابہ ۲: ۲۹۰ [5] الاصابہ ۲: ۲۸۹، الزہر النضر ص ۲۸، ۶۸

[6] ابوالقاسم محمود الزمخشری، الکشاف قاہرہ ۱۳۹۲ھ / ۱۹۷۲ء ۲: ۴۹۲ [7] الزہر النضر ص ۲۸، الجامع لاحکام القرآن ۱۱: ۱۶، ۲۹، روح المعانی ۱۵: ۳۲

[8] الاصابہ ۲: ۲۸۸ – ۲۸۹، بعض اہل کتاب کا کہنا ہے کہ حضرت خضر ان کی طرف مبعوث تھے ابوالحسن رمّانی (المتوفی ۳۸۴ھ) اور علامہ ابن جوزی نے اس کی تائید کی ہے۔ الاصابہ ۲: ۲۸۸ – ۲۸۹، الزہر النضر ص ۶۸۔

کا انکار کرتا ہے جبکہ اکثر علماء اور صوفیا ان کے حیات ہونے کے قائل ہیں۔ احادیث میں خضر کی حیات کا کوئی تذکرہ نہیں ہے اس سلسلہ میں جو احادیث بیان کی جاتی ہیں ان میں سے اکثر پر محدثین نے کلام کیا ہے۔ امام ابن حزم (۳۸۴ – ۴۵۶ھ / ۹۹۴ – ۱۰۶۴ء) نے نظریۂ حیات کو اسرائیلی افکار کے اثرات کا ثمرہ کہا ہے[۱]۔ امام ابن قیم (۶۹۱ – ۷۵۱ھ / ۱۲۹۲ – ۱۳۵۰ء) کا کہنا ہے کہ وہ تمام احادیث جن میں حضرت خضر کی حیات کا ذکر ہے سب کی سب جھوٹی ہیں۔ ان کی زندگی کے متعلق ایک بھی حدیث صحیح نہیں ہے[۲]۔ شیخ مجدالدین شیرازی (المتوفی ۸۱۷ھ / ۱۴۱۴ء) کا بیان ہے کہ خضر و الیاس علیہما السلام کی عمر اور اس کی طوالت کے باب میں کوئی حدیث صحیح نہیں ہے[۳]۔ ملا علی قاری (المتوفی ۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۶ء) موضوعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انھیں (موضوعات) میں سے وہ تمام احادیث جو حضرت خضر اور ان کی زندگی سے متعلق ہیں سب کی سب جھوٹی ہیں۔ ان میں ایک حدیث بھی صحیح نہیں ہے[۴]۔ ابوالحسین ابن المنادی (المتوفی ۳۳۶ھ / ۹۴۷ء) کا کہنا ہے کہ خضر کی بقاء کے باب میں کوئی حدیث صحیح نہیں ہے[۵]۔

اس سے خضر علیہ السلام کی حیات کی یکسر نفی بھی نہیں ہوتی۔ صحابہ اور تابعین کے ساتھ خضرؑ کی ملاقات کے متعلق متعدد روایات منقول ہیں۔ ان میں سے اکثر پر محدثین نے کلام کیا ہے۔ علامہ ابن جوزی نے "عجالۃ المنتظر فی شرح حال الخضر" میں ان روایات کو اعتراض کا ہدف بنایا ہے مگر دوسرے محدثین کے نزدیک ان میں سے بعض روایات صحیح بھی ہیں[۶]۔

جو علماء حضرتِ خضرؑ کی حیات کے منکر ہیں۔ ان میں امام بخاری (۱۹۴ – ۲۵۶ھ / ۸۰۹ – ۸۶۹ء) محدث ابراہیم حربی (۱۹۸ – ۲۸۵ھ / ۸۱۵ – ۸۹۸ء) امام علی بن موسیٰ رضا (۱۵۶ – ۲۰۸ھ / ۷۷۲ – ۸۲۳ء) ابوالحسن منادی، ابن حزم، ابن جوزی اور ابن قیم شامل ہیں قاضی ابوبکر ابن العربی (المتوفی ۵۴۳ھ / ۱۱۴۸ء) کا بیان ہے کہ

---

[۱] امام ابن حزم۔ الفصل فی الملل والاہواء والنحل، دار المعرفۃ بیروت لبنان الطبعۃ الثانیۃ ۱۳۹۵ھ / ۱۹۷۵ء (المجلد الثالث) ۴: ۱۸۰

[۲] امام ابن قیم الجوزیہ۔ المنار المنیف تحقیق عبدالفتاح ابوغدہ مکتبۃ المطبوعات الاسلامیہ حلب الطبعۃ الثانیۃ ۱۴۰۲ھ / ۱۹۸۲ء ص ۶۷

[۳] شیخ مجدالدین شیرازی۔ سفر السعادۃ علی ہامش کشف الغمۃ، مطبع مصطفیٰ البابی الحلبی و اولادہ بمصر القاہرۃ ۱۳۷۰ھ / ۱۹۵۱ء

[۴] ملا علی قاری۔ الموضوعات الکبیر، المطبع الرفیع المجتبائی دہلی ۱۳۱۵ھ ص ص ۹۶ - ۹۷

[۵] حیات الحیوان الکبریٰ ۱: ۴۸۴۔

[۶] حیات الحیوان الکبریٰ ۱: ۴۸۵، قصص الانبیاء ۲: ۵۳۳، ۵۳۹، الاصابہ ۲: ۳۱۹

حضرت خضر علیہ السلام نے پہلی صدی ہجری کے اختتام سے پہلے وفات پائی[۱] امام بخاری سے حضرت خضر کے زندہ ہونے کے متعلق سوال کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا "ایسا کس طرح ممکن ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو فرمایا ہے۔

لایبقی علی رأس مئة سنة ممن	صدی کے خاتمہ پر ان میں سے کوئی باقی
ھو الیوم علی ظھر الارض احد[۲]	نہیں بچے گا جو اس وقت زمین پر موجود ہیں۔

امام ابراہیم حربی سے بھی منقول ہے کہ خضرؑ وفات پا چکے ہیں[۳] ابوالحسین بن المنادی، علی بن موسی الرضا ابویعلی بن القرار الحنبلی (المتوفی ۴۵۸ھ/۱۰۶۵ء) ابو طاہر بن العبادی ابوالفضل بن ناصر ابوبکر بن محمد بن الحسین النقاش (۲۶۶ - ۳۵۱ھ/۸۷۹ء) بھی حضرت خضر کی وفات کے قائل ہیں[۴]۔ علامہ ابن جوزی نے کہا ہے کہ خضر کے زندہ نہ ہونے پر چار چیزیں دلالت کرتی ہیں (ا) قرآن (ب) سنت (ج) اجماع محققین (د) عقل۔ انھوں نے قرآن کی آیت وماجعلنا لبشر من قبلك الخلد..... الخ، متفق علیہ حدیث ارائیکم لیلتکم ھذہ فان علی راس مئة سنة منھا لایبقی علی ظھر الارض ممن ھو الیوم (علیھا) احد اور مسلم کی حدیث "ما من نفس منفوسة یاتی علیھا مئة سنة وھی یومئذٍ حیة" سے استشہاد کیا ہے۔ اجماع محققین میں انھوں نے امام بخاری، امام علی بن موسیٰ رضا، امام ابراہیم حربی اور دوسرے علماء کے متعلق لکھا ہے کہ ان سب نے حضرت خضر کے زندہ ہونے سے انکار کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے دس عقلی دلیلوں سے بھی خضرؑ کی حیات کے تصور کو مسترد کیا ہے[۵]۔ ابوحیان کا بیان ہے کہ جمہور کی رائے یہ ہے کہ وہ وفات پا چکے ہیں[۶]۔ امام ابن قیم کا کہنا ہے کہ کئی ائمہ سے یہی سوال کیا گیا تو انھوں نے جواب میں قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی:

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ	ہم نے آپ سے پہلے کسی بشر کو دائمی
الْخُلْدَ اَفَاِنْ مِّتَّ فَهُمُ	زندگی نہیں دی۔ اگر آپ وفات پائیں کیا
الْخَالِدُوْنَ[۷] (الانبیاء: ۳۴)	یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے۔

---

[۱] حیاۃ الحیوان الکبریٰ ۱: ۳۸۴ [۲] المنار المنیف ص ۶۸ [۳] ایضاً ص ۶۷
[۴] الزہر النضر ص ص ۸۶، ۸۹ [۵] المنار المنیف ص ص ۶۹-۷۶
[۶] الزہر النضر ص ۸۶ [۷] المنار المنیف ص ۶۸

امام ابن تیمیہ (۶۶۱ – ۷۲۸ھ / ۱۲۶۳ – ۱۳۲۸ء) سے عام طور پر یہی نقل کیا جاتا ہے کہ وہ حیات خضر کے منکر ہیں[1] لیکن ان سے ایسی رائے بھی منقول ہے جس میں خضر کی وفات کے قائلین کی دلیل پر گرفت کی گئی ہے[2]

علماء کی اکثریت کا خیال ہے کہ حضرت خضر زندہ ہیں۔ صحیح مسلم میں ایک حدیث ہے کہ دجال مدینہ منورہ سے متصل ایک مقام پر پہنچے گا تو ایک صالح انسان اس کے پاس جا کر کہے گا "میں گواہی دیتا ہوں کہ تم وہی دجال ہو جس کی خبر ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے" دجال لوگوں سے کہے گا کہ اگر میں اس شخص کو تمہارے سامنے قتل کر دوں تو کیا تم میرے معاملے میں شک کرو گے۔ لوگ جواب دیں گے "نہیں" اس کے بعد دجال اسے قتل کرے گا پھر اسے دوبارہ زندہ کرے گا۔ زندہ ہونے کے بعد صالح انسان کہے گا قسم اللہ کی اب تو مجھے تمہارے بارے میں زیادہ یقین ہوا کہ تم ہی دجال ہو۔ پس دجال اسے قتل کرنے کا ارادہ کرے گا مگر وہ قابو نہیں پائے گا۔[3] حدیث کے راوی ابراہیم بن سفیان کا کہنا ہے کہ یہ صالح انسان خضر علیہ السلام ہوں گے۔[4] صحیح مسلم کے شارح امام نووی کا بیان ہے کہ اس حدیث سے حضرت خضر علیہ السلام کا حیات ہونا ظاہر ہے[5] امام ثعلبی کہتے ہیں کہ تمام اقوال کے مطابق خضر علیہ السلام معمر نبی ہیں اور لوگوں کی آنکھوں سے پوشیدہ ہیں[6] شیخ ابن الصلاح (۵۷۷ – ۶۴۳ھ / ۱۱۸۱ – ۱۲۴۵ء) کا کہنا ہے کہ جمہور علماء اور صالحین کے نزدیک وہ (خضرؑ) زندہ ہیں۔ عام لوگ بھی انھیں کے ہم رائے ہیں صرف

---

[1] شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ۔ مجموع فتاویٰ، جمع و ترتیب عبدالرحمٰن بن محمد بن قاسم العاصمی النجدی، الحنبلی وابنہ محمد، مکہ، قاہرہ ۱۳۸۲ھ ۲۷: ۱۰۰۔

[2] مجموع فتاویٰ ۴: ۳۳۷ – ۳۴۰۔

[3] صحیح مسلم بشرح نووی۔ کتاب الفتن باب ذکر الدجال، تہذیب الاسماء واللغات ۱: ۱۷۷۔

[4] صحیح مسلم بشرح نووی۔ کتاب الفتن باب ذکر الدجال، تہذیب الاسماء واللغات: ۱: ۱۷۷، تاریخ الخمیس ۱: ۱۲۱۔

[5] صحیح مسلم بشرح نووی کتاب الفتن باب ذکر الدجال، تہذیب الاسماء واللغات ۱: ۱۷۷

[6] قصص الانبیاء المسمی بالعرائس ص۲۴۱

بعض محدثین کو اس سے انکار ہے[1] امام نووی کا بیان ہے کہ جمہور علماء کی رائے ہے کہ وہ ہمارے درمیان زندہ ہیں اور یہ رائے صوفیہ، صلحا اور عرفا کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ خضر کو دیکھنے، ان سے ملاقات کرنے، سوال وجواب کرنے اور پاک اور متبرک مقامات پر ان کی موجودگی کے بارے میں ان کی حکایات اتنی زیادہ اور مشہور ہیں کہ انھیں نہ شمار کیا جا سکتا ہے اور نہ چھپایا ہی جا سکتا ہے[2]

صوفیہ کے یہاں عام خیال یہ ہے کہ حضرت خضر بقید حیات ہیں۔ شیخ عبداللہ بن اسعد یافعی (المتوفی ۷۶۸ھ/۱۳۶۶ء) کا عقیدہ تھا کہ خضر زندہ ہیں۔ ان کے سامنے امام بخاری اور ابراہیم حربی کے انکار کا ذکر کیا گیا تو غضبناک ہو کر بولے مجھے اس شخص پر غصہ آتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ ان کی وفات ہوئی ہے[3]۔ ایک بڑے بزرگ کا کہنا ہے کہ جہل کی انتہا یہ ہے کہ کوئی شخص خضر اور الیاس کے وجود کا منکر ہو[4]۔ مراۃ الاسرار کے مصنف نے بھی الیاس اور خضر علیہما السلام کے وجود کے انکار کو جہل کی انتہا کہا ہے[5]۔

حضرت خضر علیہ السلام کی حیات اور وفات کی تائید میں فریقین نے جو دلائل دئے ہیں ان کا بغور جائزہ لینے پر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حیات کے منکرین کے دلائل میں وزن نہیں ہے۔ انھوں نے قرآن حکیم کی آیت " وماجعلنا لبشر من قبلك الخلد افان مت فهم الخلدون" سے استدلال کیا ہے لیکن یہ استدلال درست نہیں ہے آیت کریمہ میں عام انسانوں کے بقائے دوام کی نفی کی گئی ہے۔ معلوم ہے کہ حضرت عیسیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے مبعوث کیے گئے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی موت موخر کر کے انھیں آسمان پر اٹھا لیا۔ جس طرح آیت کریمہ سے حضرت عیسیٰ کی موت پر دلیل لانا صحیح نہیں ہے اسی طرح حضرت خضر یا حضرت الیاس کی موت پر استدلال کرنا درست نہیں

۱؎ ابن الصلاح۔ فتاوی ابن الصلاح، القاہرہ ۲۸، تہذیب الاسماء واللغات ۱: ۱۷۷، صحیح مسلم بشرح نووی کتاب الفضائل، فضائل الخضر، حیات الحیوان الکبری ۱: ۳۸۴

۲؎ تہذیب الاسماء واللغات ۱: ۱۷۶-۱۷۷

۳؎ الزہر النضر ص ۱۶۱

۴؎ رسالہ ابدالیہ ص ۲۸

۵؎ مراۃ الاسرار ۱: ۳۵

ہے۔ احادیث رسولؐ میں سے منکرین حیات نے متفق علیہ حدیث "فان علی راس مئة سنة لا یبقی علی ظہر الارض ممن ھو الیوم (علیہا) احد" اور مسلم میں اسی مضمون کی حدیث "مامن نفس منفوسة یاتی علیہا مئة سنة وھی یومئذٍ حیة" سے استشہاد کیا ہے، مگر یہ استدلال بھی کمزور ہے، ممکن ہے حضرت خضر اس وقت زمین پر نہیں سمندر یا دریا میں کسی کشتی پر رہے ہوں گے۔ صحیحین کی روایات میں دجال اور جساسہ کا ذکر بالتفصیل موجود ہے۔ دونوں عہد نبوی میں موجود تھے اور آج تک زندہ ہیں۔ جب ان کی موت پر ان احادیث سے استدلال نہیں کیا جاتا تو حضرت خضر کی موت پر ان سے استدلال کرنا کیسے درست ہے۔ ہماری اس رائے کی تائید خود امام ابن تیمیہ کے ایک فتویٰ سے بھی ہوتی ہے[۱]۔ علامہ ابن جوزی نے حضرت خضر کی حیات کے انکار میں جو دس عقلی دلیلیں دی ہیں ان میں بھی کوئی جان نہیں ہے۔ پھر حضرت خضر سے بے شمار لوگوں کی ملاقات کے واقعات صحیح طریقوں سے منقول ہیں انھیں روایت یا درایت کے کسی اصول سے رد نہیں کیا جا سکتا۔ خود کبار محدثین نے کثرت طرق کے ساتھ انھیں نقل کیا ہے ان دلائل کی روشنی میں حضرت خضر کا حیات ہونا اقرب الی الصواب معلوم ہوتا ہے۔

تصوف میں حضرت خضر کا مقام و مرتبہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ صوفیہ کو ہر دور میں ان کی ذات سے دلچسپی یا ان کی تلاش و جستجو رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیہ کی کتابوں میں کسی نہ کسی صورت میں ان کا ذکر آتا ہے۔ ان کے بارے میں کتب تصوف میں جو تفصیلات آتی ہیں وہ ایک بحث طلب موضوع ہیں۔ لیکن موضوع کی مناسبت سے صوفیہ کے افکار و واقعات کا ذکر ضروری ہے۔

شیخ محی الدین ابن عربی کا بیان ہے کہ حضرت خضر کا تعلق اولیاء اللہ کے اس طبقہ سے ہے جو "مفردان" کہلاتا ہے۔ بعثت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق بھی "مفردان" سے تھا[۲]۔ ابدال کی طرح چونکہ حضرت خضر بھی عام لوگوں سے اوجھل رہتے ہیں اس لیے انھیں "رئیس الابدال" کہا جاتا ہے[۳]۔ بعض صوفیہ انھیں "نقیب الاولیا" کہتے ہیں۔ صوفیہ

---

[۱] مجموع فتاویٰ ۴: ۳۳۹ - ۳۴۰

[۲] محمد دارا شکوہ، سفینۃ الاولیا، مطبع نولکشور کانپور بار دوم ۱۹۰۰ء ص ۵۷

[۳] امام غزالی، احیاء علوم الدین، مکتبہ مصطفیٰ البابی الحلبی و اولادہ بمصر القاہرہ ۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۹ء ۱: ۴۷-۳

کے بقول ان کے ساتھ بڑی عمر کے دس بزرگ ہوتے ہیں، یہ لوگ حضرت خضر کی خدمت کرتے ہیں۔ خاص طور پر بیماری میں ان کا بہت خیال رکھتے ہیں[1]

صوفیہ کے بیان کے مطابق حضرت خضر لوگوں کی تعلیم وتادیب کے لیے مقرر ہیں۔ اس سلسلہ میں مولانا یعقوب چرخی کہتے ہیں کہ ابتدائے حال میں میرے دل میں حصول تعلیم کے لیے سفر کا شوق پیدا ہوا لیکن اسباب میسر نہ تھے چنانچہ میں متوجہ ہوا تو خواب میں خواجہ خضر کو فرماتے ہوئے سنا کہ حصول علم کے لیے نکلو جہاں اور جب حاجت پیش آئے مجھے یاد کرنا۔ میں نے یہی کیا بعد میں مجھے تجربہ سے معلوم ہوا کہ یہ خواب رحمانی تھا[2] شیخ عبدالوہاب شعرانی (۸۹۸ — ۹۷۳ھ / ۱۴۹۲ — ۱۵۶۵ء) کا کہنا ہے کہ حضرت خضر مشائخ سے حالت بیداری میں ملاقات کرتے ہیں اور مریدوں کو خواب میں آکر تصوف کی تعلیم دیتے ہیں کیونکہ وہ لوگ حالت بیداری میں خضر کے دیدار کی تاب نہیں لا سکتے[3] حضرت خضر سے ملاقات کے لیے ضروری ہے کہ صوفی کل کے لیے کوئی خیرا ٹھا نہ رکھے[4]

تصوف کی کتابوں میں حضرت خضر سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے کے لیے مخصوص عبادات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ شیخ نظام الدین اولیاء (۶۴۵ — ۷۲۵ھ / ۱۲۴۷ — ۱۳۲۴ء) نے اس مقصد کے حصول کے لیے ایک خاص نماز "صلوٰۃ الخضر" کا ذکر کیا ہے۔ دس رکعت پر مشتمل صلوٰۃ الخضر پانچ سلاموں کے ساتھ ظہر کی نماز کے بعد پڑھی جاتی ہے۔ اس میں قرآن مجید کی آخری دس سورتوں کی قرآت کی جاتی ہے[5] شیخ کا کہنا ہے کہ جو شخص اس نماز کو پابندی کے ساتھ ادا کرتا رہے گا اس کی ملاقات حضرت خضر کے ساتھ ضرور ہوگی[6]

= شاہ ولی اللہ دہلوی۔ النوادر مشمولہ المسلسلات مکتبہ یحیویہ سہارنپور ۱۳۸۵ھ / ۱۹۶۵ء ص ۵۷

[1] رسالہ ابدالیہ ص ۲۹

[2] رسالہ ابدالیہ ص ۲۸ - ۲۹

[3] شیخ عبدالوہاب شعرانی۔ تنبیہ المغترین المطبعۃ المیمنیہ مصر ۱۳۱۰ھ / ۱۳۲۳ھ ص ۵۴

[4] تنبیہ المغترین ص ۵۴۔

[5] امیر حسن علا سجزی۔ فوائد الفواد مطبع نولکشور لکھنؤ بار چہارم ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء ص ۲۱

[6] فوائد الفواد ص ۲۱۔

شیخ قطب الدین بختیار کاکی (۵۸۳-۶۳۴ھ / ۱۱۸۷-۱۲۳۶ء) کے آبائی قصبہ اوش کی ایک غیر آباد مسجد کے بارے میں مشہور تھا کہ اس میں جو کوئی ایک مخصوص دوگانہ ادا کرتا ہے اس کی ملاقات حضرت خضر سے ہوتی ہے[1]۔ چنانچہ شیخ قطب الدین بختیار کاکی نے ماہ رمضان کی ایک رات اس مسجد میں دو رکعت نماز پڑھی اور اس کے بعد مسجد کے منارے پر جسے ہفت منارہ کہتے تھے ہفت دعا (ایک خاص دعا) پڑھی۔ اسی رات انھیں اس مسجد میں حضرت خضر کے پیچھے نماز تراویح پڑھنے کا شرف حاصل ہوا[2]۔

حضرت خضر کے ساتھ صوفیہ کی ملاقاتوں کا تذکرہ ادب تصوف میں عام ہے۔ بہت سے بزرگوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھیں حضرت خضر سے ملاقات کا شرف حاصل تھا۔ بعض صوفیہ نے ان سے خرقۂ طریقت پایا ہے اور بعض کو مخصوص اوراد و وظائف بھی ملے۔ شیخ محمد بن علی المعروف بہ حکیم ترمذی (المتوفی ۳۲۰ھ / ۹۳۲ء) کے بارے میں ان کے مرید شیخ ابوبکر وراق (المتوفی ۳۴۷ھ / ۹۵۸ء) بیان کرتے ہیں کہ حضرت خضر ہر اتوار کو ان سے ملنے آیا کرتے تھے۔ دونوں میں تبادلۂ خیال ہوتا تھا اور دونوں ایک دوسرے کا حال پوچھتے تھے[3]۔ شیخ ابوبکر کتانی (المتوفی ۳۲۲ھ / ۹۳۴ء) کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ حضرت خضر کے مصاحبین میں سے تھے[4]۔ بعض بزرگوں کے بارے میں آیا ہے کہ انھوں نے خرقۂ طریقت حضرت خضر سے پایا ہے[5]۔ شیخ محی الدین ابن عربی کو بھی حضرت خضر سے خرقۂ طریقت ملا تھا[6]۔ بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ انھوں نے اوراد و وظائف کی تعلیم حضرت خضر سے پائی ہے مثلاً شیخ ابراہیم التیمی (المتوفی ۹۲ھ / ۷۱۰ء) کو حضرت خضر نے مسبحات عشر (ایک مخصوص تسبیح) کی تلقین کی اور آخر میں کہا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ

---

[1] فوائد الفواد ص ۱۲۳، سید محمد بن مبارک علوی کرمانی۔ سیر الاولیا، اسلام آباد / لاہور ۱۳۹۸ھ / ۱۹۷۸ء ص ۶۱

[2] سیر الاولیا، ص ۶۱

[3] شیخ ابو الحسن علی بن عثمان الجلابی الہجویری۔ کشف المحجوب اسلام آباد ۱۹۷۸ء ص ۱۲۹، سفینۃ الاولیا، بذیل تذکرہ حکیم ترمذی

[4] سفینۃ الاولیا ص ۱۲۶ [5] J.S.Trimingham - The Sufi orders in Islam, Oxford University press 1973 P.P. 42,63, 114,262,279

[6] مولانا عبد الرحمن جامی۔ نفحات الانس، مطبع نولکشور کانپور ۱۸۹۳ء ص ۳۵۷، سفینۃ الاولیا، ص ۶۷

علیہ وسلم نے اس کی تعلیم دی ہے[1] شیخ ابراہیم بن ادہم (المتوفی ۱۶۲ھ/۷۷۹ء) کو حضرت خضر نے اسم اعظم لکھایا اور چند نصیحتیں کیں[2] ایک اور بزرگ کا بیان ہے کہ طریقۂ شاذلیہ کے اذکار و اوراد انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بذریعہ خضر ملے جبکہ دونوں ان کے سامنے متشکل ہوئے تھے[3]

صوفیہ کے یہاں حضرت خضر کی شناخت کا مسئلہ چنداں دشوار نہیں ہے بعض بزرگ انھیں دیکھتے ہی پہچان لیتے ہیں۔ شیخ عبد القادر جیلانی (۴۷۱—۵۶۱ھ/۱۰۷۸—۱۱۶۶ء) ایک روز منبر پر علوم و معارف بیان کر رہے تھے کہ وہاں سے حضرت خضر گزرے۔ انھیں دیکھ کر شیخ جیلانی نے کہا "اے اسرائیلی آؤ اور ایک محمدی کا کلام سن لو"[4] بعض عارفین نے ان کی شناخت کی نشانی یہ بتائی ہے کہ ان کے ہاتھ کی بیچ والی انگلی دوسرے لوگوں کی انگلی کی طرح لمبی نہیں بلکہ انگشت شہادت کے برابر ہے۔ ایک اور رائے یہ ہے کہ ان کے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے میں ہڈی نہیں ہے چنانچہ مصافحہ کرتے وقت جو لوگ ملاقاتی کا انگوٹھا دبا دیتے ہیں وہ حضرت خضر کی شناخت کے لیے ایسا کرتے ہیں۔

حدیث و تصوف کی کتابوں میں حضرت خضر کے خد و خال اور ان کے اخلاق و عادات کے بارے میں جو تفصیلات ملتی ہیں۔ ان کے مطابق حضرت خضر دراز قامت، کبیر ہامت اور باریک سر ہیں[5] سر اور داڑھی کے بال سفید ہیں۔ ان کے جسم کی ہڈیاں بڑی بڑی شانے چوڑے اور سینہ کشادہ ہے[6] ایک اور روایت کے مطابق حضرت خضر بلند قامت امردوش، سبزی مائل، درازمو، تنگ عارض، کشادہ ابرو، ہاتھ پاؤں

---

[1] احیاء علوم الدین ۱: ۲۴۶-۳، شیخ عبد الرؤف المناوی، الکواکب الدریہ تصحیح محمود حسن ربیع مصر ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء ۱: ۴۷

[2] الکواکب الدریہ ۱: ۱۷۴، کشف المحجوب ص ۹۷

[3] ابو محمد عبد الاحد۔ اوراد الصوفیہ، خلافت پریس بمبئی ص ۱۶-۱۷

[4] شیخ مجدد الف ثانی۔ المنتخبات من المکتوبات مکتوب ۵۲ استنبول ترکی ۱۹۷۵ء ص ۱۵۱، بعض علماء کے نزدیک شیخ جیلانی کا یہ کلام حضرت خضر کے اسرائیلی ہونے کی دلیل ہے لیکن یہ رائے محل نظر ہے کیونکہ موسیٰ بنی اسرائیل کی طرف مبعوث تھے اور حضرت خضر ان کے متبعین میں سے نہیں تھے۔ دیکھئے مجموع فتاوی ۱۱: ۲۵، ۲۶۲-۲۶۷، عبد اللہ بن شوذب کا قول ہے کہ خضر اولاد فارس سے اور الیاس بنی اسرائیل سے ہیں۔ دیکھئے قصص الانبیاء المسمی بالعرائس ص ۲۲۱، تاریخ الطبری ۱: ۲۲۰، الکامل فی التاریخ ۱: ۱۶۰

[5] رسالۂ ابدالیہ ص ۲۹ [6] الاصابہ ۲: ۳۱۱

قدرے سخت، نرم خو، غمزہ لبسام، کم التفات، سبک گام، کوتاہ جامہ، کہنہ دستار، درشت جامہ، بے تکلف اور بے رعونت ہیں۔ اچانک نمودار ہوتے ہیں معلوم نہیں ہوتا کہاں سے آئے اس طرح غائب ہوتے ہیں کہ پتہ نہیں چلتا کہاں گئے[1] ان کا لباس ایک ازار اور ایک چادر ہے جو کبھی بوسیدہ نہیں ہوتے[2] ایک روایت کے مطابق وہ محرم کی طرح دو موٹے کپڑوں میں ملبوس ہوتے ہیں[3]

صوفیہ کا بیان ہے کہ حضرت خضر بازار میں گھوم کر کوئی چیز خریدتے ہیں اور پھر اسے بیچتے ہیں[4] وہ دلالوں کے بھیس میں ہوتے ہیں اور دلالی کر کے اجرت لیتے ہیں[5] ایک بیان میں کہا گیا ہے کہ حضرت خضر بیت المقدس میں باب الرحمۃ اور باب الاسباط کے درمیان رہتے ہیں[6] بخارا کے مشائخ کا بیان ہے کہ ماہ رجب کی پہلی جمعہ کو حضرت خضر بخارا میں ہوتے ہیں۔ اس خوشی میں بخارا اور سمرقند والے اس دن تہوار مناتے ہیں ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں اور اس امید میں ایک دوسرے سے مصافحہ کرتے ہیں تاکہ حضرت خضر کو پاسکیں۔

مولانا یعقوب چرخی کے بقول حضرت خضر شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل پیرا ہیں نیز ان کے مطابق حضرت خضر و حضرت الیاس جملہ اولیاء غیب وشہادت اہل سنت والجماعت کے مذہب پر ہیں[7] مراۃ الاسرار میں تصوف کی ایک مشہور کتاب عروہ کے حوالہ سے آیا ہے کہ اس زمانہ میں (۷۲۱ھ جب عروہ لکھی جارہی تھی) حضرت خضر، قطب اور ابدال امام شافعی کے مسلک کے مطابق نماز ادا کرتے تھے۔ شیخ مجدد الف ثانی (۹۷۱–۱۰۳۴ھ / ۱۵۶۴–۱۶۲۴ء) نے ایک مرتبہ حضرت خضر سے پوچھا کہ کیا آپ امام شافعی (۱۵۰–۲۰۴ھ / ۷۶۷–۸۲۰ء) کے مذہب کے موافق نماز ادا کرتے ہیں انھوں نے جواب دیا کہ ہم شرائع کے ساتھ نہیں ہیں لیکن چونکہ قطب مدار کے کام ہمارے ذمہ ہیں اور قطب مدار امام شافعی کے مذہب پر ہے اس لیے ہم اس کے پیچھے

---

[1] سید مظفر علی شاہ۔ جواہر غیبی ، مطبع نولکشور ۱۸۹۸ء ص ۲۵۲

[2] الکواکب الدریہ ۱: ۲۳۹ [3] الاصابہ ۲: ۳۱۱

[4] رسالہ ابدالیہ ص۳۳ [5] رسالہ ابدالیہ ص۳۳ ، مراۃ الاسرار ۱: ۳۵

[6] تاریخ الخمیس ۱: ۱۲۱ [7] رسالہ ابدالیہ ص۳۳-۳۴

[8] مجدد الف ثانی ۔مکتوبات امام ربانی۔ کراچی / استنبول ۱۳۹۷ھ / ۱۹۷۷ء مکتوب ۲۸۲ ۱: ۵۲۲ ، ۵۲۳

امام شافعی کے مذہب کے مطابق نماز ادا کرتے ہیں[۱]

ادب تصوف میں حضرت خضر کے اخلاق وعادات کے بارے میں اور بھی تفصیلات ملتی ہیں جنھیں بخوف طوالت اس وقت نظر انداز کیا جاتا ہے۔

خلاصہ کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ حضرت خضر کے معمر نبی اور بقید حیات ہونے کے حق میں مضبوط دلائل ہیں۔ آپ کو حضرت موسیٰ کی امت میں شامل ماننا ضروری نہیں کیوں کہ بنی اسرائیل سے آپ کا تعلق ثابت نہیں۔ سورہ کہف میں ان کے واقعہ سے یہ دلیل بھی نہیں لائی جا سکتی کہ کوئی شخص انبیاء کی لائی ہوئی شریعت سے بے نیاز ہو سکتا ہے۔ یوں بھی حضرت موسیٰؑ کی بعثت بنی اسرائیل کے لیے خاص تھی لہٰذا حضرت خضر کے لیے ان کا پیرو کار ہونا ضروری نہ تھا۔ جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت قیامت تک کے لیے تمام انسانوں اور جنوں کے لیے عام ہے۔ حضرت خضر بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ ہمارے اس قول کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ بعض صوفیہ نے انھیں مسلک شافعی کا پیرو کار بتایا ہے۔ اسی طرح آب حیات یا چشمہ حیوان کے تصور کو بھی شاعری کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا بلکہ مفسرین، محدثین، مورخین کی ایک جماعت اور صوفیہ نے اسے ایک امر واقعہ کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے۔ بحث کے آخر میں یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خضر کی وفات یا حیات کا مسئلہ ایمانیات یا عقائد سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ ایمان وعقیدہ کی اساس محکمات پر ہوتی ہے۔ قرآن وسنت میں جناب خضر کی حیات یا وفات کے متعلق ایسی کوئی خبر نہیں ہے جسے محکمات کے درجہ میں رکھا جا سکتا ہے۔

---

[۱] مجدد الف ثانی۔ مکتوبات امام ربانی۔ کراچی / استانبول ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۷ء مکتوب ۲۸۲ ۱: ۵۳۳، ۵۳۲

عہد نبوی کے غزوات وسرایا

ڈاکٹر رؤفہ اقبال صاحبہ نے اس تصنیف میں اسلام کے نظریہ جہاد پر اسلامی موقف کی بے لاگ ترجمانی کی ہے اور اس پر کیے جانے والے اعتراضات کا مسکت اور مدلل جواب دیا ہے۔

آفسٹ کی طباعت۔ صفحات ۲۲۷ قیمت ۲۵ روپئے

ملنے کا پتا: ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی۔ پان والی کوٹھی۔ دودھ پور۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

دعوتِ نبوی کے طریقے

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

دعوت و تبلیغ کا حکمِ الٰہی آنے کے بعد رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے جوش و خروش کے ساتھ اپنا فریضۂ رسالت ادا کرنا شروع کیا۔ یہ روایت و حقیقت سب کو معلوم ہے کہ مکی عہد (۱۳ - ۱ سنہ نبوی / ۶۱۰ - ۲۲) کے تیرہ ۱۳ سالہ دور کو دعوتِ اسلامی کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے: اول تین سالہ دور جب خفیہ طور سے اسلام کی تبلیغ کی گئی اور دوم باقی دس سالہ زمانہ جو علانیہ تبلیغ کا مرحلہ کہلاتا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحابِ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بہ بانگِ دہل اللہ اور اس کے دین کی طرف مکہ والوں کو خاص کر اور تمام انسانوں کو عام طور سے بلاتے تھے[۱]۔ دعوتِ نبوی کے یہ دونوں طریقے اور انداز حکمِ الٰہی کی تعمیل میں تھے۔ مصالح اور حالات کا تقاضا بھی تھا اور فطرتِ الٰہی جس پر انسانوں کی تخلیق کی گئی ہے اور اصولِ الٰہی جو کبھی تبدیل نہیں ہوتے، کی مانگ بھی تھی کہ آہستہ روی اور تدریج کے ساتھ اسلامی دعوت کو لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ سیرت نگاروں اور اسلامی تاریخ کے عالموں میں سے ماہرین و اماموں نے بھی خفیہ تبلیغ کی مصالح اور علانیہ دعوت کے اسباب سے خاطر خواہ بحث نہیں کی ہے۔ بالعموم یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ دعوت کو عام کرنے سے قبل اس کی تیاری اور اسلام کی اشاعت کے لیے زمین ہموار کرنے کی ضرورت تھی[۲]۔ بلاشبہ یہ بات کسی حد تک صحیح ہے لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ اہم اسباب تھے۔ ان میں سے ایک اہم سبب یہ تھا کہ علانیہ دعوت کے نتیجہ میں مخالفت و عداوت ہونی لازمی اور فطری تھی اس لیے مصلحت اسی میں تھی کہ جہاں تک ممکن ہو مخالفت و اختلاف سے بچا جائے، دوسرے یہ کہ خفیہ تبلیغ کے ذریعہ دعوتِ اسلامی کا بنیادی کام مکمل کر لیا جائے تاکہ اگلے مشکل دور کی تیاری ہو جائے۔ تیسرے یہ بھی دیکھنا مقصود تھا کہ دعوت کے کام کی کامیابی کی حد اور

امکانات کیا اور کتنے ہیں اور اس کی راہ میں کیا کیا مشکلات آسکتی ہیں۔ چوتھے اللہ کے مومنوں اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثاروں کی ایک پختہ ایمان اور بلند کردار جماعت بن جائے جو تبلیغ و دعوت کا کام جاری رکھ سکے اور سب سے بڑھ کر آئندہ زمانہ اور اجنبی حالات میں اسلام کی دعوت کا کام کرنے والوں کے لیے ایک اسوۂ نبوی فراہم ہو جائے[۶]

خفیہ تبلیغ کے سہ سالہ دور میں دعوتِ نبوی کے طریقوں کا ذکر بالعموم ہماری متداول سیرتی کتابوں میں اور اصلی ماخذ میں کم ملتا ہے جبکہ علانیہ دعوت کے عہد کے دعوتی طریقوں کی تفصیل نسبتاً زیادہ ملتی ہے۔ بہر حال روایات و واقعات کے پہلو بہ پہلو کچھ قوی قرائن اور مستحکم اشارات ایسے ملتے ہیں جن کی بنیاد پر نبوی دعوت کے طریقوں کو بہتر طور سے سمجھا جاسکتا ہے اور ان سے صحیح استفادہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ البتہ ابتدائی مسلمانوں کے سوانحی تذکروں میں ان کے قبولِ اسلام کے حالات واسباب کے ساتھ ساتھ دعوت کے طریقوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ان سے ایک اہم اور بنیادی حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ فترۂ وحی کے مختصر وقفہ کے بعد سورہ مدثر کے نزول کے ساتھ ہی منصب رسالت کے اعلان اور دعوت و تبلیغ کے فریضہ کا آغاز ہو گیا تھا۔[۷] دعوتِ اسلامی کے ضمن میں دوسری اہم حقیقت یہ ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ اولین مسلمانوں پر بھی بحیثیت امتِ مسلمہ یہ فرض عائد ہو گیا تھا کہ وہ بھی خفیہ طور سے سہی اپنے دین اسلام کی دعوت و تبلیغ شروع کر دیں۔ صحابۂ کرام کی دعوت و تبلیغ کو محض ان کے جوشِ ایمانی اور نومسلم ولولۂ ایمانی پر محمول نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ سورۂ مدثر میں جو احکام تبلیغ و دعوت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت رسول اللہ دئے گئے تھے وہ مسلمانوں کو بحیثیت امتِ مسلمہ عطا کیے گئے تھے اور اس حقیقت کی تائید ان دوسرے احکامِ الٰہی سے ہوتی ہے جو جسمانی اور روحانی تطہیر اور شرک سے اجتناب اور توحید و عبادتِ الٰہی پر ثبات و قیام کے سلسلہ میں آپ کو دئے گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ صرف آپ کی ذاتِ گرامی تک محدود نہ تھے اگرچہ خطابِ الٰہی صرف آپ سے ہے بلکہ ان کی فطری اور منطقی توسیع تمام امتِ مسلمہ کے لیے ہر زمانے اور ہر عہد میں کی گئی ہے۔[۸] امتِ مسلمہ کے فرائض کے بارے میں ابتدائی دور میں نازل ہونے والی دوسری آیاتِ قرآنی بھی اس کی تائید مزید کرتی ہیں[۹] اور ان سب سے بڑھ کر یہ حقیقت اور صورتِ واقعہ اس کی توثیق کرتی ہے کہ صحابۂ کرام کی خفیہ تبلیغ اور بعد

کے دور میں علانیہ دعوت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایما منشا اور ارشاد کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ کیونکہ مبلغین اسلام اس کے بغیر کوئی اقدام نہیں کر سکتے تھے۔

دعوتِ نبوی کے آغاز اور اولین مسلمانوں کے قبولِ اسلام کے سلسلہ میں کئی طریقے واضح طور سے نظر آتے ہیں۔ پہلا طریقہ اہلِ بیتِ نبوی کے ضمن میں یہ ملتا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ عبادت اور عمل کو دیکھ کر ان کے دل و دماغ میں سوال پیدا ہوا اور ان کے استفسار کے بعد رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اللہ اور اس کے دین کی طرف بلایا اور قبول و ایمان میں تردد دیکھ کر ان کو معاملہ پوشیدہ رکھنے کا حکم دیا۔ جیساکہ حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی، جو آپ کے پروردہ اور گھر کے فرد تھے اور حضرت زید بن حارثہ کلبی جو آپ کے متبنٰی اور آزاد کردہ غلام تھے کے بارے میں بالترتیب وضاحت اور اضمار کے ساتھ ملتا ہے[۸] دوسرا طریقہ حضرت خدیجہ بنتِ خویلد اسدی، آپ کی زوجۂ مطہرہ، اور آپ کی بناتِ مطہرات کے ضمن میں دکھائی دیتا ہے جو بقول مولانا شبلی "سننے سے پہلے مومن تھیں"[۹] تیسرا طریقہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں نظر آتا ہے کہ آپ کی نبوت و رسالت کا آوازہ (جو خفیہ دورِ تبلیغ میں ہی پھیلنا شروع ہوا تھا) مکہ مکرمہ میں خاص خاص لوگوں اور قریب ترین حلقوں میں ہوا وہ فوراً خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے اور دین و دعوت کی تصدیق چاہی اور اس کے ملتے ہی اسلام قبول کر لیا۔ ان کا معاملہ خاص تھا کہ حق معلوم ہونے کے بعد انھوں نے ذرا بھی شک کیا اور نہ قبول کرنے میں دیر لگائی[۱۰] ان اولین مسلمانوں کے قبولِ اسلام کے بعد امتِ مسلمہ کے دعوت و تبلیغ کا کام کرنے کا مرحلہ شروع ہوتا ہے اور دعوت کا چوتھا طریقہ یہ ملتا ہے کہ حضرت ابوبکر اپنے حلقۂ احباب اور دائرۂ اثر میں دین کی دعوت کا پرجوش و ولولہ آگیں کام شروع کر دیتے ہیں اور کم از کم پانچ مزید افراد کو شروع ہی میں اسلام کے دائرہ میں داخل کرتے ہیں۔ تبلیغ و دعوت کا اولین کام یا ابتدائی زمین ہموار کرنے کا مرحلہ وہ انجام دیتے ہیں اور اس کا اصل اور اہم مرحلہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و ارشاد کے ذریعہ پورا ہوتا ہے[۱۱] حضرت ابوبکر صدیق کی دعوت و تبلیغ کا دائرہ صرف انھیں ابتدائی مسلمانوں تک محدود نہ تھا بلکہ وہ تاعمر اور تمام ادوار میں یہ فریضہ انجام دیتے رہے[۱۲] ان کے علاوہ دوسرے ابتدائی مسلمانوں کی خفیہ دعوت و تبلیغ کے کام کا بہت صراحت و وضاحت کے ساتھ ذکر نہیں ملتا لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر

مسلم ہے کہ حضرت خدیجہ نے خاص کر عورتوں کے حلقہ میں اور دوسرے بزرگوں نے اپنے اپنے حلقوں میں دعوت و تبلیغ کا کام پوری تندہی سے انجام دیا تھا[۱۲]

نومسلم صحابہ کرام کی ترغیب و تبلیغ سے مکہ مکرمہ کے سر برآوردہ خاندانوں کے نوجوانوں کے علاوہ بعض باہر کے دوسرے قبائل کے اشخاص و جماعات بھی متاثر ہوئے اور خدمت نبوی میں حاضر ہوکر اسلام لائے۔ اس طریقہ سے اسلام غالباً کافی کثرت سے پھیلا۔ حضرت خالد بن سعید اموی ابتدائی مسلمانوں میں تھے۔ وہ بھی حضرت ابوبکر صدیق کی دعوت پر اسلام کی طرف راغب ہوئے اور بالآخر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر اسے قبول کیا[۱۳]۔ حضرت عثمان بن عفان اموی کو اسلام کی اولین ترغیب و تبلیغ کرنے والی ان کی اپنی خالہ سعدی تھیں۔ جنھوں نے ان کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور دعوت سے اول اول روشناس کرایا۔ ان کے کلام کا ان کے دل پر بہت اثر ہوا جس کا ذکر حضرت عثمان نے حضرت ابوبکر صدیق سے کیا اور پھر ان کی ترغیب مزید اور دعوتِ صریح سے متاثر ہو کر وہ بارگاہ نبوی میں پہونچے اور آپ کی دعوتِ توحید الٰہی اور رسالتِ محمدی پر اسلام قبول کیا[۱۴] حضرت ابوبکر صدیق کی ہی دعوت و تبلیغ سے متاثر ہوکر حضرت عثمان بن عفان اموی کے قبول اسلام کے دوسرے ہی روز حضرات عثمان بن مظعون جمحی، ابوعبیدہ بن الجراح فہری، ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومی اور ارقم بن ارقم مخزومی خدمتِ نبوی میں حاضر ہوکر دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئے۔ ایک اور روایت کے مطابق ان بزرگوں کے ساتھ حضرت عبیدہ بن الحارث مطلبی بھی تھے۔ روایات کے مطابق ان تمام حضرات نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دار ارقم میں قیام سے قبل اسلام قبول کیا تھا[۱۵] اسلام قبول کرنے کا ایک اہم سبب اور تبلیغ اسلام کا ایک کارگر طریقہ نماز کی عبادت کا مشاہدہ و مظاہرہ تھا۔ حضرت علی کی مانند ان کے برادر بزرگ حضرت جعفر بن ابی طالب ہاشمی نے بھی آپ کو نماز پڑھتے دیکھ کر اسلام قبول کیا تھا[۱۶] جبکہ دوسرے موقع پر حضرت عفیف کندی جو جنوبی عرب کے قبیلہ کندہ کے فرد تھے آپ کو مکہ کی ایک گھاٹی میں نماز پڑھتے دیکھ کر اسلام قبول کرتے کرتے رہ گئے تھے اور بعد میں اسی واقعہ نے ان کو اسلام کی طرف راغب کیا تھا[۱۷] اگرچہ اسلام کی دعوت و تبلیغ خفیہ انداز سے کی جارہی تھی تاہم وہ ایسا معمولی واقعہ نہ تھا جس کی شہرت نہ ہوتی یا آوازہ نہ پھیلتا، خاص کر تین برسوں میں کم از کم تین مواسم حج آئے تھے اور ان

مقدس مواقع پر ہزارہا افراد حج کے مناسک ادا کرنے کے لیے مکہ مکرمہ پہونچے تھے اور ان گنت لوگوں نے ان تین برسوں میں عمرہ کیے تھے یا تجارت کی غرض سے مکہ کے پھیرے لگائے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں مسلم اور غیر مسلم مکی تاجروں نے عرب و شام و یمن کے متعدد بازاروں میں تجارت و کاروبار کے لیے پہونچ کر مثبت یا منفی انداز سے اسلام کی شہرت عام کی تھی اور اس شہرت و آوازہ نے بہت سے لوگوں کو اسلام کی طرف راغب ہی نہیں کیا بلکہ مکہ مکرمہ پہونچ کر خدمتِ نبوی میں حاضری دے کر اسے قبول کرنے کی سعادت بخشی تھی۔

باشندگان مکہ مکرمہ میں متعدد ایسے مردوں اور خواتین کا ذکر ملتا ہے جو آپ کی دعوت کا شہرہ سن کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کی دعوت سنی اور اسلام قبول کیا۔ ان میں سے دو بزرگ حضرت عمار بن یاسر مذحجی اور حضرت صہیب بن سنان عنزی ہیں۔ دونوں حسنِ اتفاق سے دار ارقم کے دروازہ پر ایک دوسرے سے ملے اور دونوں کی حاضری ایک ہی مقصد سے ہوئی تھی۔ خدمت نبوی میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا اور دونوں اسی وقت حلقہ بگوش ہو گئے[۱۸] مکہ مکرمہ کے بیشتر سابقین اولین کے قبولِ اسلام میں غالبًا اسی طریقہ سے نسبتًا زیادہ مدد ملی تھی لیکن اس کے بارے میں زیادہ کہنا یوں مشکل ہے کہ بیشتر حضرات و خواتین کے قبولِ اسلام کے حالات و اسباب کی تفصیلات نہیں ملتیں[۱۹]۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے بدوی قبائل اور مکہ مکرمہ کے باہر کے دوسرے افراد نے بھی اسی طریقے سے اسلام قبول کیا تھا۔ ان میں سے حضرت ابوذر غفاری اور ان کے عزیزوں اور حضرت عمرو بن عبسہ ازدی کے قبولِ اسلام کے واقعات بہت مشہور ہیں۔ ابن اسحاق کی روایت کے مطابق حضرت ابوذر غفاری اپنے بھائی اور ایک عم زاد کے ساتھ آپ کی بعثت کی خبر سننے کے بعد مکہ مکرمہ پہونچے اور مکہ مکرمہ کے کسی درہ یا گھاٹی میں آپ سے ملاقات کر کے آپ کا پیغام سنا اور تینوں نے قبول کیا جبکہ ابن ہشام کی مشہور روایت کے مطابق صورت واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابوذر غفاری نے آپ کے ظہور کی خبر سنی تو تحقیق حال کے لیے اپنے بھائی انیس غفاری کو بھیجا۔ وہ مکہ مکرمہ میں معلومات حاصل کر کے گئے تو حضرت ابوذر کو ان کے بیان سے تشفی نہیں ہوئی اور وہ خود اکیلے پہونچے۔ حالات ایسے تھے اور رازداری اتنی تھی کہ مکہ مکرمہ میں علی الاعلان کسی سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھ نہ سکتے

تھے حالانکہ حضرت علی سے دو روز متواتر ملاقاتیں رہیں۔ بالآخر تیسری ملاقات میں ان کی تمنا برآئی اور حضرت علی کے ذریعہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دار ارقم میں آپ کی ملاقات ہوئی۔ آپ نے اپنی دعوت پیش کی اور وہ دل و جان سے اسلام لے آئے۔[۲۰] بیرونی بدوی قبائل کے تمام سابقین اولین کے قبول اسلام میں آپ کی دعوت کے شہرہ اور دین اسلام کے آوازہ کے خفیہ طور سے ہی پھیلنے کے طریقہ نے امداد کی تھی خواہ ان حضرات نے اپنے اپنے علاقوں میں سنا ہو، یا عرب کے بازاروں اور میلوں ٹھیلوں میں واقفیت حاصل کی ہو یا مکہ مکرمہ پہونچ کر صورت حال سے واقفیت حاصل کی ہو۔ حضرات طفیل بن عمرو ازدی، ابوموسیٰ اشعری، معیقب بن ابی فاطمہ دوسی اور متعدد دوسرے معلوم و معروف یا غیر معلوم و غیر معروف سابقین اولین کے قبول دین حق میں یہی حقیقی امر واقعہ رہا تھا۔[۲۱]

دعوت اسلامی کا ایک اہم مرحلہ اور دعوت نبوی کا ایک عظیم طریقہ دار ارقم کو تبلیغ و دعوت کا مرکز بنانا تھا۔ سیرت نگاروں اور تاریخ دانوں کے درمیان اس امر پر اختلاف ہے اور کافی ابہام بھی کہ دار ارقم کو کب اسلامی مرکز بنایا گیا۔[۲۲] لیکن واقعات، بیانات اور قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت کے اولین مراحل میں ہی جب غیر معمولی کامیابی ملی اور اچھی خاصی تعداد میں مکہ مکرمہ کے لوگ مسلمان ہو گئے تو آپ نے دین کی مصلحت اور دعوت کی عافیت اسی میں دیکھی کہ کسی الگ تھلگ جگہ کو مرکز دعوت بنائیں کیونکہ آپ کا مکان مبارک نہ صرف شہر کے آباد و معروف علاقہ میں واقع تھا جہاں آنے جانے والوں پر نظر رکھی جا سکتی تھی اور غیر معمولی آمد و رفت دوسروں کو خاص کر ٹوہ لگانے والوں کو متوجہ کر سکتی تھی۔ دوسرے یہ کہ آپ کا گھر بعض بدباطن پڑوسیوں کے درمیان واقع تھا جو دعوتی سرگرمیوں کو دیکھ کر اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے لیے مسائل و مشکلات پیدا کر سکتے تھے۔[۲۳] یہ اور ان جیسے دوسرے مصالح دینی و تحریکی کے پیش نظر آپ نے حضرت ارقم بن ارقم مخزومی کا مکان بطور مرکز دعوت منتخب کیا جو کوہ صفا کی تلہٹی میں واقع ہونے کے سبب الگ تھلگ تھا۔[۲۴] عام تاثر یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس دار ارقم میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔ لیکن صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ دعوت و تبلیغ اور نومسلموں کی اسلامی تعلیم و تربیت کے لیے وہاں مخصوص اوقات میں قیام فرماتے تھے۔ اسی دوران

کی مسلمان وہاں جمع ہو کر تعلیم و تربیت حاصل کرتے، قرآن و نماز پڑھنے اور اخلاقِ فاضلہ سیکھتے اور وہیں حق کے متلاشی غیر مسلم خواہ مکہ مکرمہ کے ہوں یا باہر کے از خود یا مسلمانوں میں سے کسی کے توسط سے حاضرِ خدمت ہوتے اور آپ کی دعوت سنتے۔ دارارقم خفیہ تبلیغ کے بقیہ زمانے میں اسلامی دعوت کا مرکز تو رہا ہی علانیہ دعوت کے اولین تین برسوں تک یعنی حضرت عمر بن خطاب عدوی کے قبولِ اسلام کے عظیم الشان اور عہد ساز واقعہ تک واحد مرکزِ اسلام رہا۔ بقیہ مکی دورِ نبوی میں دارارقم کی مرکزی حیثیت ضرور برقرار رہی تاہم اب کئی دوسرے اسلامی مراکز بھی بن گئے تھے جہاں صحابہ کرام مصالحِ دینی اور مقاصدِ اسلامی کے تحت جمع ہوا کرتے تھے[۲۶]۔ ان مراکز کا ذکر اور ان کی اہمیت پر بحث بعد میں آئے گی۔ یہاں خفیہ دور میں دارِارقم کی اہمیت اور مرکزیت پر نظر مرکوز رکھنی مقصود ہے۔

ابن سعد نے خاص کر اور بعض دوسرے قدیم سیرت نگاروں اور مورخوں نے عام طور سے ان سابقین اولین کے قبولِ اسلام کا ذکر کیا ہے جو دارِارقم میں دخولِ نبوی سے قبل یا اس کے بعد دینِ حق میں داخل ہوئے تھے۔ ابن سعد خاص کر ان کے قبولِ اسلام کے زمانے کی تصریح کرتے ہیں۔ اگرچہ بیشتر حالات و احوال میں وہ دعوتِ نبوی کے طریقوں کا ذکر نہیں کرتے لیکن کہیں کہیں کسی نہ کسی طریقہ کا ذکرِ صریح یا اس کا مضمر قرینہ مل جاتا ہے۔ عام حالات میں دارارقم میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دخول سے قبل جن اہم بزرگوں / سابقون اولون کے قبول اسلام کا ذکر کیا ہے ان میں حضرات عبیدہ بن حارث مطلبی، عثمان بن عفان اموی، ابو حذیفہ ہشیم بن عتبہ عبدشمسی، عبداللہ بن جحش اسدی/خزیمہ اور ان کے دو بھائی عبیداللہ اور ابو احمد وغیرہ بہت ممتاز ہیں۔ ابن سعد نے اول الذکر کے بارے میں یہ صراحت کی ہے کہ دارارقم میں دعوت اسلام دینے سے قبل وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔ لیکن دعوتِ نبوی کے طریقہ کے بارے میں ابن سعد کا وہ بیان زیادہ واضح اور اہم ہے جو انھوں نے حضرت مصعب بن عمیر عبدری (بنو عبدالدار) کے قبول اسلام کے ضمن میں دیا ہے۔ ان کو کسی ذریعہ سے جس کی صراحت ابن سعد نے نہیں کی خبر پہونچی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دارِارقم بن ابی الارقم میں اسلام کی دعوت دیتے ہیں تو وہ آپ کے پاس حاضر ہوئے، اسلام قبول کیا اور آپ کی تصدیق کی۔ پھر وہ اپنے گھر چلے گئے، اور اپنی ماں اور اپنی قوم سے اپنا اسلام چھپائے رکھا۔ اس

دوران وہ برابر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔[۲۷]

حضرت مصعب بن عمیر عبدری کی مانند بعض دوسرے مکی مسلمانوں نے بھی اس زمانہ میں اسلام قبول کیا جب آپ دارِ ارقم کو مرکز دعوت بنا کر لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف خفیہ طور سے یا علانیہ بلا رہے تھے۔ ان میں حضرات عمار بن یاسر مذحجی اور صہیب بن سنان نمری کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ ان کے بیان کا ایک حصہ بڑا دلچسپ ہے۔ دارِ ارقم میں اسلام قبول کرنے کے بعد وہ شام تک وہاں مقیم رہے پھر چھپتے چھپاتے وہاں سے نکلے (اور اپنے گھروں کو گئے) غالباً یہ احتیاط کی بنا پر تھا کہ مبادا کسی نے ان کو دارارقم میں آتے/داخل ہوتے دیکھ لیا ہو۔[۲۸] ابن سعد کا ایک عام بیان یہ ہے کہ اول/شروع اسلام میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دارارقم میں ہوا کرتے تھے اور دعوت دیا کرتے تھے اور وہاں بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ ان میں سے حضرات عاقل بن ابی البکیر، اور ان کے کم از کم تین بھائیوں عامر، ایاس اور خالد وغیرہ کے علاوہ متعدد افراد شامل تھے۔[۲۹]

خفیہ دورِ تبلیغ میں جب مکی تاجر و مسافر واپس وطن آتے تھے تو حالات پوچھتے تھے خاص کر اس باب میں استفسار کرتے کہ کوئی نیا واقعہ تو نہیں ہوا۔ حضرت طلحہ بن عبید اللہ تیمی جب شام کے سفر تجارت سے واپس مکہ پہنچے تو پوچھا کہ کوئی نیا واقعہ؟ بتایا گیا کہ حضرت محمد بن عبد اللہ الامین نبی ہو گئے ہیں (تنبأ) اور ابن ابی قحافہ (ابوبکر) ان کے پیرو بن گئے ہیں۔ اس کے بعد وہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملے اور اسلام لائے تھے۔[۳۰]

اس دور کا ایک اہم طریقۂ دعوت معجزۂ نبوی بھی تھا۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود ہذلی اول اول ایک معجزۂ نبوی سے اسلام کی طرف مائل ہوئے تھے۔ وہ آپ کے ایک پڑوسی عقبہ بن ابی معیط اموی کے نوجوان چرواہے تھے اور اجرت پر اس کی بکریاں چراتے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر ایک بار مشرکین سے بچ کر ان کی چراگاہ آنکلے اور انھوں نے جب ان سے دودھ مانگا تو عبد اللہ بن مسعود نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ امانت دار ہیں اور مالک کے مال میں خیانت نہ کریں گے۔ اس پر آپ نے ایک کنواری بکری کے تھنوں پر دعا پڑھی اور وہ دودھاری ہو گئی اور دودھ پینے کے بعد اس کو ویسا ہی کر دیا۔ حضرت عبد اللہ اس سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے اور امکان ہے کہ

اور حضرات بھی اس طریقہ سے مومن بنے ہوں لیکن یہ خاص نبوی طریقہ تھا۔[۳۱]

علانیہ دعوت کا دور

تین برسوں کی مسلسل اور جاں گسل مساعیٔ دعوت کے بعد جب اسلام کی راہ ہموار ہوگئی اور پختہ اہل ایمان کی مضبوط جماعت وجود میں آگئی تو حکمِ الٰہی آیا کہ اب اسلام کی دعوت علانیہ دی جائے اور بات کھول کر سب کے سامنے واشگاف کر دی جائے ابن اسحاق نے اس حکمِ الٰہی کو تین آیاتِ کریمہ کے حوالہ سے پیش کیا ہے یعنی سورہ حجر ۹۴، سورہ شعرا ۲۱۴-۲۱۵ اور سورہ حجر ۸۹ جبکہ ابن ہشام نے اولین دو ہی آیاتِ قرآنی کا ذکر کیا ہے۔ عام طور سے سیرت نگاروں نے اظہارِ اسلام و اعلانِ حق کے لیے انھیں آیات کا ذکر کیا ہے اور دعوتِ اسلامی کے اولین علانیہ مرحلہ کو سورۂ شعرا کی مذکورہ بالا آیات مقدسہ کے مطابق قریب ترین اعزہ کو دعوت اسلام دینے سے تعبیر کیا ہے[۳۲] جس کے بعد تمام مکہ والوں کو دعوت دینے کا مرحلہ آیا اور پھر تمام عرب کے باشندوں اور اس کے بعد پوری بنی نوع انسانی کو۔ یہاں ایک اہم حقیقت پر مزید بحث کرنی ضروری معلوم ہوتی ہے کیونکہ جدید مورخوں خاص کر متعصب سیرت نگاروں اور اسلام دشمن مستشرقوں نے اس پر پردہ ڈال کر نہ صرف حقیقت کو چھپانے کا جرم کیا ہے بلکہ دوسروں کو اپنی تحریروں اور تقریروں سے گمراہ کرنے کی کوشش بھی کی ہے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ علانیہ دعوت کے مذکورہ بالا چار مرحلے تھے جو اسلام کے اصولِ تدریج اور الٰہی قانونِ ارتقاء کے عین مطابق اور تابع تھے حکمت و دانش بھی یہی کہتی ہے کہ پہلے قریب ترین عزیزوں کو پھر دوسرے رشتہ داروں، پڑوسیوں اور شہر والوں، پھر پورے عرب والوں کو اور ان کے بعد ساری دنیا کے انسانوں کو دعوت دی جاتی۔ جیسا کہ دعوتِ نبوی میں ہوا بھی۔ لیکن بد باطن مورخوں اور عصبیت کے مارے مستشرقوں نے ان مراحلِ دعوت سے اسلام کی علاقائیت اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی محدودیت کا تصور ایجاد کیا حالانکہ آپ کی دعوت شروع سے آفاقی اور ابدی تھی اور سارے انسانوں کے لیے اور تا قیامِ قیامت تھی اور ہے۔[۳۳] یہ بحث مزید تفصیل کی متقاضی ہے جس کا یہاں موقع نہیں۔ علانیہ دعوتِ حق اور تبلیغِ اسلام کے دور کے شروع ہوتے ہی رسول اکرمؐ

نے پرانے دعوتی طریقوں کو بروئے کار لانے کے ساتھ ساتھ بعض نئے طریقوں سے بھی کام لیا کہ بدلے ہوئے حالات میں ان کی ضرورت بھی تھی اور افادیت بھی زیادہ تھی۔

دعوتِ عام و علانیہ کا اولین طریقہ یہ تھا کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "کسی خوف اور جھجک کے بغیر حرم میں جا کر نماز پڑھنی شروع کر دی جس کی ہمت آپ کے سوا اور کوئی نہ کر سکتا تھا" سیرت نگاروں میں مولانا مودودی غالبًا واحد شخص ہیں جنھوں نے سورۂ علق اقراء کی آیاتِ کریمہ ۹-۱۹ کے ذریعہ یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام کا اولین اظہار مسجدِ حرم میں علی الاعلان نماز پڑھ کر کیا اور اس واقعہ نے قریش کے اکابر کو بھی اور عام لوگوں کو بھی یہ احساس کرا دیا کہ "آپ کا دین ان کے دین سے بدل گیا ہے"[۳۴] اس پر یہ اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ واقعہ نہ صرف اسلام کا اولین اظہار تھا بلکہ دعوتِ اسلامی اور تبلیغ نبوی کا عملی اور شاید موثر ترین طریقہ تھا۔ کیونکہ نماز کے ارکانِ جسمانی کے علاوہ اس میں تلاوتِ قرآن مجید بھی کی جاتی تھی اور اس طرح بالواسطہ طور سے ہی قریش کے سامنے اللہ کا پیغام پیش کیا جاتا تھا۔

نماز میں اور نماز کے علاوہ عام تلاوت کے ذریعہ قرآن مجید کی آیاتِ کریمہ کی قرارت کرنا رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تو معمول ہی تھا آپ کے اصحاب کرام کا بھی تھا اور یہ بڑا مؤثر طریقۂ دعوت اور ذریعۂ تبلیغ تھا۔ اس سے قریش کے لوگوں کو اللہ کا دین سمجھایا جاتا تھا۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ "جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کا نزول ہوتا تو آپ پہلے اسے مردوں کے سامنے تلاوت کرتے پھر عورتوں کے سامنے"[۳۵] نماز میں آپ کی تلاوتِ قرآن سن کر پہلی بار حضرت عمر بن خطاب کے دل میں اسلام کی رفعت و محبت پیدا ہوئی تھی[۳۶] اگرچہ قریش کے متعدد اکابر جیسے ابوسفیان بن حرب اموی، ابوجہل مخزومی اور اخنس بن شریق ثقفی وغیرہ آپ کی تلاوتِ قرآن سن لینے کے بعد بھی مسلمان نہیں ہوئے لیکن ان کے دل اسلام کی حقانیت کے معترف ہو چکے تھے[۳۷] اور متعدد دوسرے مردوں اور عورتوں کو آپ نے اسی طریقہ سے اسلام سے روشناس کرایا تھا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجدِ حرام میں اپنی نمازوں اور مجلسوں میں قرآن کریم کی تلاوت و قرارت تو کیا ہی کرتے تھے، اپنے گھر کے صحن میں بھی قرآن مجید کی آیات پڑھا کرتے تھے جن کو سننے کے لیے قریش کے عام و خاص جمع ہو جایا کرتے تھے[۳۸] اور ظاہر

ہے کہ آپ بخوبی جانتے تھے کہ قریش اور دوسرے اہل مکہ قرآن مجید کی حقانیت، روحانیت اور قوت تاثیر کے ہاتھوں کھنچے چلے آتے ہیں تاکہ آپ کی زبان مبارک سے سنیں۔

صحابۂ کرام بھی دعوتِ اسلامی کے اس طاقتور ترین اور موثر ترین وسیلہ کی تاثیر اور کارفرمائی سے خوب واقف تھے کہ اسی نے زیادہ تر ان کے دلوں کی دنیا بدلی، ان کو راہِ حق سجھائی اور ان کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی پر آمادہ کیا تھا۔ وہ بھی علانیہ قراءتِ قرآنِ کریم کے ذریعہ قریش کے لوگوں کو بالواسطہ دعوتِ اسلامی دیتے تھے اور اسلامی احکام و اصول سکھاتے تھے۔ عام طور سے حضرت عبداللہ بن مسعود ہذلی کے قریشی اکابر کے سامنے ان کی مجلس میں قرآنی آیات تلاوت کرنے کے واقعہ کو ہمارے تمام قدیم وجدید سیرت نگاروں نے ایمانی جوش اور اسلامی خروش کا ایک بے قابو جذبہ اور بیکراں ولولہ بنا کر پیش کیا ہے کہ انھوں نے محض ایمانی جذبہ کے مظاہرہ کے لیے ان کے سامنے تلاوت کی اور مار کھائی اور اسلام میں علانیہ تلاوت قرآن کرنے والے اولین شخص بنے[۴۹] حالانکہ حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ محض مظاہرۂ اسلامی اور اظہارِ ہمت مردانہ نہیں تھا بلکہ قریش کے سامنے تلاوت کلام الٰہی کے ذریعہ اسلام اور اس کی تعلیمات کو پیش کرنا اور ان کو دینِ حق اور اتباعِ رسول کی دعوت دینا تھا۔ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق جب قریشِ مکہ کی حرکات سے تنگ آکر ہجرت کے لیے مکہ مکرمہ سے نکلے اور راستہ میں ایک بدوی سردار ابن الدغنہ کی کوشش و حمایت میں واپس وطن آئے تو اپنے گھر کے دروازے (باب دارہ) کے پاس ایک مسجد بنالی۔ وہاں نماز میں قرآن مجید پڑھتے اور خوب روتے کہ وہ بے انتہا رقیق القلب بزرگ تھے۔ قریشی عورتیں بچے اور غلام ان کی تلاوت سننے کے لیے جمع ہو جاتے اور کلام الٰہی سے اور ان کی رقت بھری تلاوت سے متاثر ہوتے۔ قریشی اکابر نے اپنے آل و اولاد کو جب اس "فتنہ" میں پڑتے دیکھا تو ابوبکر صدیق کے حامی ابن الدغنہ سے فریاد کی اور اس نے حضرت ابوبکر سے زور سے تلاوت قرآن نہ کرنے کے لیے کہا مگر انھوں نے انکار کر دیا اور اس کی حمایت وجوار واپس کر دی۔ یہ صرف حضرت ابوبکر کی جرأتِ ایمانی اور حمیت دینی کا معاملہ نہ تھا بلکہ تبلیغ دین کا ایک مؤثر ذریعہ بھی جسے وہ ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے[۵۰] اس موثر ترین وسیلۂ تبلیغ و دعوت کے متعدد دوسرے واقعات ہیں جن میں سے کئی ایک کا ذکر آئندہ نبوی دعوت اور صحابی تبلیغ کے طریقوں کے ضمن میں آتا رہے گا۔

علانیہ دعوتِ نبوی کا باقاعدہ اصطلاحی آغاز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعوتِ طعام سے ہوا جو آپ نے اپنے قریب ترین عزیزوں کو حکمِ الٰہی کی تعمیل میں اسلام کی طرف بلانے کے لیے کی تھی۔ بلاذری کی ایک روایت ہے کہ اس دعوت سے قبل آپ نے اپنی چہیتی اور شفیق پھوپھیوں سے مشورہ کیا تھا اور انھوں نے تائید و تصویب کی تھی مگر ابولہب ہاشمی سے باخبر بھی کیا تھا کہ وہی گڑبڑ کر سکتا ہے۔ ابن اسحاق و ابن ہشام وغیرہ کی بیان کردہ روایت مشہور کے مطابق آپ نے بنو عبد مناف کو کھانے کی دعوت دی اور بعد طعام اپنا پیغام پیش کرنا چاہا تو ابولہب نے آپ کو کچھ کہنے ہی نہ دیا اور اسی طرح دوسری مجلس دعوت و طعام بھی اس نے درہم برہم کر دی مگر بلاذری کی بیان کردہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کے بعد اپنا کلام و پیغام پیش کیا اور حلیم و بردبار اور سنجیدہ لوگوں نے اسے خوشدلی سے سنا بھی اور آپ سے نرم خوئی سے پیش آئے اور محبت آمیز کلام کیا اور غور و فکر کے لیے مہلت مانگی مگر ابولہب ہاشمی واحد خاندانی عزیز تھا جس نے اپنی سخت کلامی اور سخت ردی سے آپ کی دعوت ٹھکرا دی تھی۔ خاندانِ بنو عبد مناف کو حکمِ الٰہی وانذر عشیرتك الاقربین (اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو انذار کرو) کی تعمیل میں دعوتِ طعام کے ذریعہ تبلیغ نبوی کی جتنی روایات ملتی ہیں ان میں بلاذری کی بیان کردہ روایات نہ صرف قرین قیاس، انسانی نفسیات کے مطابق اور عقل و دانش کے موافق ہیں بلکہ قریش کے مشہور و معروف اور فطری حلم و تدبر سے بھی میل کھاتی ہیں[۱۰]۔ عام تاثر یہ بن گیا ہے کہ اس ایک یا دو دعوتوں کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاندان والوں کو مزید دعوتِ اسلام نہیں دی یا ان کو بھی اپنی عمومی دعوت و تبلیغ ہی سے نوازتے تھے۔ روایاتِ سیرت اور احادیث سے خاص کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ مختلف اوقات میں جب بھی خاندان والوں کے ساتھ ملاقات یا اجتماع کا موقع ملتا اپنی دعوت پیش کرتے رہتے تھے اور تسلسل و تواتر کے ساتھ پیش کرتے رہتے تھے۔ اس کی تصدیق اس روایت سے ہوتی ہے جس میں آپ نے اپنے خاندان والوں اور خاندانوں کا نام لے کر اور قریب ترین افراد جیسے حضرت صفیہ اور حضرت فاطمہ کو مخاطب کر کے اسلام کی دعوت دی تھی[۱۱]۔

اپنے عزیز ترین اور قریب ترین رشتہ داروں (عشیرتك الاقربین) کو علانیہ

اور با قاعدہ دعوتِ اسلام دینے اور ان پر دین ربانی اور مذہب الٰہی پیش کرنے کی حجت تمام کرنے کے بعد آپ نے دعوت و تبلیغ کا دوسرا منطقی قدم اٹھایا اور ایک دن کوہ صفا پر چڑھ کر نام بنام تمام قریشی قبیلوں اور مکہ والوں کو پکارا اور جب ان کے کافی اور نمائندہ لوگ جمع ہوگئے تو آپ نے ان کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی اور اس موقع پر وہ خطبہ ارشاد فرمایا جو مشہور ہونے کے علاوہ بڑا مؤثر بھی ہے۔ دعوت و تبلیغ نبوی کا یہ ایک اہم ترین مرحلہ اور مؤثر ترین طریقہ تھا کہ اس طریقہ سے آپ نے اپنے شہر کے تمام طبقات کے سامنے واشگاف انداز میں اسلام کی دعوت پیش کردی تھی اور اپنے خاندان اور اعزہ کے ساتھ ساتھ سب کو خطاب عام کیا تھا۔ ہمارے مآخذ میں اس خطبۂ نبوی اور دعوتِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کئی روایات ملتی ہیں اور ہمارے محققین علماء و سیرت نگاران میں سے صحیح ترین روایت کا انتخاب اور بقیہ کی تردید میں لگ جاتے ہیں بلاشبہ صحیح کی تلاش اور غلط کی تردید بھی ایک اہم کام ہے۔ لیکن ان روایات کی یہ توجیہ بھی کی جاسکتی ہے اور وہ خاص منطقی ہی نہیں بلکہ دوسری روایات و قرائن اور شواہد کی مصدقہ بھی ہے کہ یہ مختلف روایات مختلف و متعدد مواقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ عام اور تبلیغ علانیہ کی نمائندگی کرتی ہیں اور ان کا تعلق صرف ایک واقعۂ دعوت و تبلیغ سے نہیں ہے۔ اس حقیقت مسلمہ سے کوئی انکار کرنے کی جرات نہیں کرسکتا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تسلسل و تواتر کے ساتھ بلکہ جان کھپا کر تبلیغ و دعوت کا کام کرتے تھے اور جس کی شہادت خود قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے دی بلکہ آپ کو از حد مشقت اور جان ہلاکت میں ڈالنے سے مربیانہ اور والہانہ نصیحت بھی فرمائی، لیکن آپ کا جذبۂ خیر، شوق تبلیغ اور جوشِ دعوت اتنا بڑھا ہوا اور بیکراں تھا کہ ہر قیمت پر جلد از جلد سب لوگوں تک اسلام پہونچانے اور ان کو دائرہ ایمان میں لانے کی سعی بلیغ کرتے رہے۔ ان شواہد و مسلمات کی روشنی میں یہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے خاندان اور رشتہ داروں کی طرح مکہ والوں کو بھی بار بار کوہِ صفا سے مسجدِ حرام سے اور دوسرے عوامی مقامات سے پکارا تھا اور خیر کی طرف بلایا تھا۔[۳۱]

علانیہ دعوت و تبلیغ کے دو اہم ترین اقدامات اور طریقوں کے علاوہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خفیہ تبلیغ کے دور کا مؤثر ترین طریقہ یعنی افراد و طبقات سے

شخصی ملاقاتوں اور ان ملاقاتوں میں دعوت وارشاد کرنے کا سلسلۂ خیر بھی جاری رکھا۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح قبائل عرب کو اللہ تعالیٰ اور اسلام کی طرف دعوت دینا شروع کی آنحضرت مختلف قبائل کے پاس بہ نفس نفیس تشریف لے جاتے اور جو ہدایت ورحمت اللہ کی طرف سے آپ کے پاس آتی اسے لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے۔" اسی طرح مکہ مکرمہ میں جو شخص خواہ قابل ذکر ہو یا نہ ہو جزیرہ نمائے عرب کے کسی بھی مقام، علاقہ یا گوشہ سے آتا آپ اس سے ملتے اور اسے اللہ کا دین پہونچاتے آپ شب وروز ہر وقت اور ہر آن خفیہ اور علانیہ دعوت دیتے اور کسی کے روکے نہ رکے۔ آزاد وغلام، ضعیف وقوی، غنی وفقیر غرض کہ ہر طبقہ اور زمرہ کے لوگوں سے ملتے اور اللہ کی طرف بلاتے۔ عام طور سے سیرت نگار خاص کر جدید مورخین آپ کی دعوت عام اور قبائل عرب وافراد وطبقات سے ملاقاتوں کے سلسلہ میں یہ تاثر دیتے ہیں کہ یہ کام آپ نے مکی دور کے اواخر میں کیا خاص کر حضرت خدیجہ اور جناب ابوطالب ہاشمی کی وفات کے بعد اور غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے قدیم سیرت نگار د مورخین عام الحزن (سال اندوہ) کے بعد ہی قبائل سے آپ کی ملاقات ودعوت کی سرخی لگا کر یہ حقیقت متواتر و بیہم بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کے بیان میں یہ وضاحت سے آتا ہے کہ علانیہ تبلیغ یا انذار عام کے حکم الٰہی کے بعد آپ نے ہر سال قبائل سے مواسم حج میں اور مختلف مقامات پر ملاقات کی اور ان کو دعوت دی۔ البتہ بعض جدید سیرت نگاروں نے تبلیغ نبوی کے اس طریقہ کی حقیقت پالی تھی اور ان میں سے ایک مولانا مودودی بھی ہیں جو لکھتے ہیں "اپنے خاندان اور قبیلے کے لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچانے سے فارغ ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ اور عرب کے لوگوں میں عام تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا اور جب تک آپ مکہ میں مقیم رہے دس سال مسلسل ہر حال میں اور ہر جگہ لوگوں کو قرآن سناتے اور اللہ کا دین قبول کرنے کی دعوت دیتے رہے۔" اس بیان میں صرف یہ تبدیلی کرنی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ خاندان اور قبیلے اور مکہ کے تمام لوگوں کے ساتھ ساتھ آپ کی تبلیغ کا سلسلہ جاری رہا نہ کہ ان کو تبلیغ سے فراغت کے بعد کیونکہ تبلیغ ودعوت سے فراغت تو آپ کو تادم آخر نہیں ہوئی تھی بیرونی افراد وطبقات سے تو آپ کی ملاقات اور ان کو اسلام کی تبلیغ ودعوت

خاص خاص مواقع اور کبھی کبھی ہوتی تھی لیکن قریش اور دوسرے طبقاتِ مکہ سے تو آپ کا دن رات کا واسطہ تھا لہٰذا ان کو کسی حال میں نظر انداز کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ آپ ان کے عوام و خواص سے ہر حال اور ہر مقام پر ملتے اور ان کو دعوت دیتے تھے۔ اس مسلسل اور پیہم کی دعوت و تبلیغ میں آپ نے ایک اہم طریقہ اور سلیقہ یہ نکالا کہ قریشی اکابر کی مجلسوں (اندیہ/مجالس) میں جہاں اکابر کے ساتھ ساتھ ان کے قبیلہ/گروہ کے عام وخاص لوگوں کی خاصی تعداد موجود ہوتی تھی تشریف لے جاتے اور ان کے سامنے دین کی دعوت اور اسلام کی تعلیمات پیش فرماتے۔ مدتِ دراز سے قریشی اکابر خانۂ کعبہ کے اردگرد مسجدِ حرام کے صحن میں اپنی اپنی مخصوص مجلسیں اور محفلیں جمایا کرتے تھے۔ سماجی، تہذیبی اور سیاسی لحاظ سے یہ قریشی مجالس بہت اہم ہوا کرتی تھیں، کیونکہ ان میں ہر طرح کے امور خاص کر قبائلی اور قومی معاملات زیر بحث آتے تھے۔ تبلیغ اسلام اور دعوتِ حق کے لیے بھی یہ قومی/قبائلی مجالس بہت اہم تھیں اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے بھرپور فائدہ اٹھاتے تھے۔ قرآن مجید کی سورۂ علق کی آیتِ کریمہ ۱۷ فلیدع نادیہ (اب بلادے اپنی مجلس کو) میں جس نادی/مجلس کا ذکر ہے مفسرین کے خیال و توضیح میں وہ ابوجہل مخزومی کی مجلس اور اہلِ مجلس کی طرف کنایہ ہے[۲۵] اور اس کا تعلق اظہار و اعلانِ اسلام کے اولین واقعہ سے ہے جب آپ نے علانیہ دعوت دینی شروع بھی نہ کی تھی، صرف بر سرِ عام مسجدِ حرام کے صحن میں علانیہ نماز ادا کر کے اپنے دینِ حق کا اعلان ہی کیا تھا۔ بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ علانیہ تبلیغ کے دس سالہ دورِ مکی میں آپ نے مسلسل اور برابر اور اپنی ہجرتِ مدینہ تک قریشی اکابر کی مجالس و محافل میں تشریف لے جا کر ان کو طرح طرح سے دینِ حق کی طرف بلایا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ قریشی مجالس بھی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ کے دین کے ذکر سے خالی نہ ہوتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا جس کا اکابر قریش کے ذہنوں پر اثر پڑنا لازمی تھا اور اکثر و بیشتر ان کی مجالس میں اسلام اور پیغمبر اسلام کا ذکر کسی نہ کسی طور سے ضرور آتا تھا۔ دعوتِ نبوی کے طریقوں کے تجزیہ میں ان مجالس[۲۶] پر ذرا مفصل بحث کرنی ضروری معلوم ہوتی ہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی تیز رفتار کامیابی اور اشاعت سے

قریشی اکابر حیران و پریشان تھے ہی کہ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی جو آپ کے چچا اور رضاعی بھائی بھی تھے کہ قبولِ اسلام کی خبر اور واقعہ نے ان کو کافی تشویش میں مبتلا کر دیا۔ بعض دور رس اور دوربیں اور معاملہ فہم اکابرِ قریش اس مشکل سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ حضرت حمزہ کے قبول اسلام کے متصل زمانہ میں ایک دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام میں اکیلے تشریف فرما تھے اور کچھ فاصلہ پر اکابر قریش کی مجلس جمی تھی جس میں ایک عظیم سردار قریش عتبہ بن ربیعہ بھی موجود تھا۔ اس نے اہل مجلس کو مخاطب کر کے تجویز رکھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کی جائے اور ان کے سامنے کچھ تجاویز رکھی جائیں شائد وہ ان کو قبول کریں اور ہم بھی ان کو مان لیں تاکہ وہ ہمیں معاف کر دیں۔ عتبہ اپنی مجلس سے اٹھ کر آپ کے پاس آیا اور اسلام کی لائی ہوئی سماجی اور قبائلی اتھل پتھل کا ذکر کر کے آپ کے سامنے اپنی وہ تجاویز رکھیں جو بہت مشہور ہیں یعنی اگر آپ اپنی دعوت کے ذریعہ مال اکٹھا کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو ہم اتنا مال دیں کہ سب سے زیادہ مالدار بن جائیں۔ اگر شرف و سیادت درکار ہے تو آپ کو سید قریش بنالیں، اگر بادشاہت مقصود ہے تو آپ کو اپنا بادشاہ تسلیم کریں اور اگر کوئی عارضہ لاحق ہو گیا ہے جس کا علاج نہیں ہو رہا تو ہم اس کا کامل علاج کرا دیں۔ عتبہ بن ربیعہ جب اپنی تجاویز پیش کر چکا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سامنے سورہ حم سجدہ / فصلت کی آیات تلاوت کیں اور سجدہ تلاوت والی آیت پر پہونچ کر سجدہ کیا۔ عتبہ مبہوت دم بخود ششدر سنتا رہا اور جب آپ نے سجدہ کیا تو وہ بھی خود فراموشی میں حضورِ الٰہی میں سجدہ ریز ہو گیا۔ بعد میں آپ نے فرمایا کہ تم نے میری بات سن لی اب تم خود فیصلہ کر لو۔ عتبہ واپس مجلس قریش میں گیا تو سب نے اس کے بدلتے رنگ اور حال کو پہچان لیا۔ اس ملاقات اور کلامِ الٰہی کی سماعت کا اس پر یہ اثر ہوا کہ اس نے اہل مجلس کو مشورہ دیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی دعوت کو ان کے حال پر چھوڑ دو اور ان سے تعرض نہ کرو۔ بلاشبہ وہ عظیم امر ہے۔ اگر عربوں کے ہاتھوں آپ قتل ہوتے ہیں تو تمہارا کام بغیر تمہارے کیسے ہو جائے گا اور اگر وہ عرب پر غالب آتے ہیں تو آپ کا ملک تمہارا ملک (شاہی) اور آپ کی عزت تمہاری عزت ہوگی اور تم تمام لوگوں میں سب سے زیادہ خوش بخت ہو گے۔ اگرچہ اکابر قریش نے عتبہ کا مشورہ ان کی مسحوریت پر محمول کر کے نہ مانا لیکن کیا دعوتِ نبوی کے اثرات اور اسلام کے متوقع غلبہ کا ان کو احساس نہ ہوا ہوگا؟

عتبہ بن ربیعہ کے اعترافات میں اسلام کی حقانیت اور کامیابی دونوں مشہور تھیں اور قریشی اکابر پر ظاہر بھی تھیں۔[۵۷]

ابن اسحاق وغیرہ سیرت نگاروں نے ایک اور مجلس قریش کا ذکر کیا ہے جس میں تمام اکابر قریش جیسے عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابوسفیان بن حرب، نضر بن حارث، ابوالبختری بن ہشام، اسود بن مطلب، زمعہ بن اسود، ولید بن مغیرہ، ابوجہل بن ہشام، عبداللہ بن ابی امیہ، عاص بن وائل، امیہ بن خلف اور حجاج سہمی کے دو فرزند نبیہ اور منبہ اور متعدد دوسرے موجود تھے۔ یہ مجلس غروب آفتاب کے بعد صحن مسجد میں اور زیر سایۂ کعبہ منعقد ہوئی اور بحث مباحثہ کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا گیا ہے۔ آپ فوراً تشریف لائے کیونکہ آپ ان کو مسلمان بنانے اور ان تک دعوت حق پہونچانے کے حریص تھے۔ انھوں نے بھی عتبہ بن ربیعہ کی تجاویز پیش کیں تاکہ آپ اپنے کام اور دعوت سے باز آجائیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مطالبات و تجاویز کے مقابلہ میں اپنی دعوت توحید و رسالت و آخرت پیش کی لیکن وہ کٹ حجتی پر اتر آئے اور طرح طرح کے مطالبات اور تمسخر آمیز تقاضے کرنے لگے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت پہونچا کر اور ان کے اسلام سے مایوس ہو کر مجلس سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسی مجلس کے خاتمہ پر عبداللہ بن امیہ مخزومی نے آپ کے ساتھ چل کر مزید مطالبات پیش کیے جن کا ذکر بعض آیات قرآنی میں آیا ہے اور اسی مجلس کے آخر میں ابوجہل مخزومی نے آپ کے قتل کا ارادہ باندھا اور دوسرے دن اس نے اس ارادہ کو عملی روپ دینا چاہا، جب آپ نماز میں سجدہ میں گئے اور اکابر قریش اپنی اپنی مجالس میں دیکھتے رہے کہ وہ ایک بھاری پتھر سے آپ کا سر کچلنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ اچانک خوفزدہ ہو کر پلٹا اور اہل مجلس کو بتایا کہ ایک خوفناک اونٹ نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا اور مجھے کھانے دوڑا تھا۔ ظاہر ہے کہ آپ کے کلام، دعوت اور اس معجزہ نے قریشی اکابر کو بہت کچھ سمجھایا ہوگا۔[۵۸] اس کی تصدیق ایک دوسری مجلس قریش سے ہوتی ہے جس میں نضر بن حارث نے آپ کے ساحر، شاعر، کاہن و مجنوں ہونے سے انکار کر کے آپ کے اوصاف حمیدہ کا اقرار کیا تھا لیکن وہ بھی اپنے اعترافات کے باوجود مجلس نبوی کے بالمقابل اپنی مجلس جماتا اور اس میں ایرانی قصے سناتا تھا تاکہ قریش کی توجہ آپ کی دعوت سے ہٹائے رکھے۔[۵۹] ایک اور قریشی مجلس میں آپ سے متعدد سوالات پوچھے گئے تھے

جو ان کے نمائندے مدینہ کے یہودی علماء سے پوچھ کر آئے تھے تاکہ آپ کی نبوت کی صحت جانچ سکیں۔ آپ نے ان کے جواب میں آیاتِ قرآنی سنائیں اور ان پر حق واضح کر دیا۔ اعتراف حق تو ان کو تھا لیکن وہ اس کا اقرار نہ کرتے تھے۔[۵۶]

آخری مجلسِ قریش میں جو سوالات قریش نے اٹھائے تھے وہ بہت بنیادی تھے اور ان سے زیادہ اہم ان کے جواباتِ نبوی تھے جو آیاتِ الٰہی اور کلامِ ربانی کی صورت میں ان کو دئے گئے تھے۔ قریش نے مدینہ منورہ کے یہودی علماء سے پوچھ کر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اصحاب کہف، ذوالقرنین اور روح کے بارے میں سوالات کیے تھے۔ روایت کے مطابق آپ نے ان سے دوسرے دن جوابات دینے کا وعدہ کیا مگر وحی الٰہی نہ آنے کے سبب پندرہ دن تک جوابات نہ دے سکے۔ ظاہر ہے کہ آپ کو رنج و حزن ہوا اور قریشی اکابر کو مذاق اڑانے کا موقع ملا۔ بالآخر آپ نے ان کو سورۂ کہف ان کے سوالات کے جواب میں سنائی جس سے آپ کی پریشانی اور قریش کی فتنہ انگیزی ختم ہوئی اگرچہ اس دعوتی طریقہ میں الٰہی کارفرمائی تھی تاہم اس میں یہ اہم حقیقت بھی مضمر تھی کہ معترضین کے اعتراضات کا فوری جواب دینا ہر موقع و محل پر ضروری نہیں۔ ایسا دیکھا گیا ہے کہ اعتراض و جوابِ اعتراض دونوں میں جذبات کا اشتعال، مخالفانہ رویہ مناظرانہ انداز زیادہ ہوتا ہے اور افہام و تفہیم کا جذبہ کم یا سرے سے مفقود۔ مختصر مدت کے بعد قریشی مناظرانہ رنگ کم ہو گیا اور افہام و تفہیم کی صورت زیادہ پیدا ہوئی تو ان کے سوالات کا بڑا عالمانہ اور مدلل جواب دیا گیا جس نے نہ صرف ان کو خاموش کیا بلکہ اعترافِ حق پر بھی مجبور کیا، اگرچہ انھوں نے اس کا برملا اعتراف نہ کیا اور دوسری حکمتوں کے علاوہ تاخیرِ جواب میں ایک مصلحت و حکمت یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ قریش کو زیادہ تر آپ کی رسالت اور آپ کے پیغام پر اعتراض تھا۔ اس عرصہ میں قریش آپ کو مسلسل ہر حال میں اور ہر آن میں دیکھتے رہے تھے۔ آپ کو چلتے پھرتے، دعوت دیتے، مسجدِ حرام میں نماز پڑھتے اور عبادت کرتے، لوگوں سے ملتے جلتے، غرضکہ زندگی کو معمول کے مطابق گذارتے دیکھتے رہے۔ پھر یکایک آپ نے ان کے اعتراضات کو دور کیا اور ان کے سوالات کا جواب دیا۔ اس واقعہ نے قریش اور تمام دوسرے منکرین پر دوسری حقیقت واضح کی کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ

کی جانب سے ہوتا ہے، آپ کی اپنی طرف سے نہیں۔ اگر وہ آپ کے ذہن کا ساختہ پرداختہ ہوتا تو آپ وعدہ کے مطابق دوسرے دن ان کے جوابات فراہم کردیتے۔ تاخیر نے واضح کیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں اور آپ کا کلام کلام ربانی ہے۔

غیب کی خبروں کے علاوہ بعض عقلی دلائل اور وجوہ بھی ان مجالس قریش میں زیر بحث آتے تھے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے دلائل و براہین کا جواب بھی دیتے تھے۔ ایک مجلس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ولید بن مغیرہ اور متعدد دوسرے اکابر قریش کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ اسی دوران نضر بن حارث آگیا اور اس نے آپ سے حجت شروع کردی لیکن آپ نے اس کو اپنے کلام و دلائل سے خاموش کردیا غالباً یہ بحث اللہ کی عبادت اور صنم پرستی سے متعلق تھی کیونکہ آپ نے اس مجلس کے اختتام پر سورۂ انبیاء کی تین آیات ۹۸-۱۰۰ پڑھی تھیں:۔

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ	تم اور جو کچھ تم پوجتے ہو اللہ کے سوا،
اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وَارِدُوْنَ	جھونکنا ہے دوزخ میں۔ تم کو اس پر پہونچنا
لَوْكَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا	ہے اگر ہوتے یہ لوگ ٹھاکر (جھوٹے الہٰ) نہ
وَكُلٌّ فِيْهَا خَالِدُوْنَ ۝ لَهُمْ فِيْهَا	پہونچتے اس پر اور سارے اس میں پڑے
زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ۝	رہیں گے۔ ان کو وہاں چلاّنا ہے اور وہ
	اس میں بات نہیں سنتے۔

آپ کے تشریف لے جانے کے بعد عبداللہ بن زبعریٰ سہمی آیا اور جب اس کو آپ کی باتوں اور کلام الہٰی کی خبر دی گئی تو اس نے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ پوچھو کہ سب چیزیں جن کی ہم پوجا کرتے ہیں اللہ کے سوا وہ جہنم میں اپنے پوجا کرنے والوں کے ساتھ ہوں گی؟ ہم ملائکہ کی عبادت کرتے ہیں، یہود عزیر کو پوجتے ہیں اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ بن مریم کی پرستش کرتے ہیں۔ ولید بن مغیرہ، نضر بن حارث اور تمام اکابر قریش عبداللہ بن زبعریٰ کے دلائل سے بہت خوش ہوئے اور سمجھے کہ آپ پر نہ صرف حجت تمام کردی بلکہ آپ کو لاجواب بھی کردیا۔ جب آپ کو علم ہوا غالباً دوسری مجلس میں تو آپ نے فرمایا کہ اللہ کے سوا دوسری چیزوں / شخصوں کی عبادت کرنے والوں کے ساتھ جہنم میں وہی معبودان باطل جائیں گے جو اس عبادت کو پسند کرتے ہیں۔ وہ تو

شیاطین کی عبادت کرتے ہیں یا جن کی وہ ہدایت کرتے ہیں صرف ان کی عبادت کرتے ہیں"۔ انھیں کے ضمن میں سورہ مذکورہ بالا کی اگلی آیات نازل ہوئیں:

اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا	جن کو آگے ٹھہر چکی ہماری طرف سے
الْحُسْنٰىٓ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۝	نیکی، وہ اس سے دور رہیں گے نہیں سنتے
لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا وَهُمْ فِيْ مَا	اس کی آہٹ، اور وہ اپنے جی کے مزوں
اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ (۲۱-۱۰۱)	میں سدا رہیں گے۔

اس طرح آپ نے قریشی دلائل کا مسکت جواب فراہم کرکے ان پر توحید الٰہی اور شرک کی حقیقت پوری طرح واضح کر دی[۵۱]

قریش نے جب یہ دیکھا کہ آپ توحیدِ الٰہی چھوڑنے والے نہیں ہیں تو انھوں نے ایک دوسری مجلس میں جس میں ولید بن مغیرہ، اسود بن مطلب، امیہ بن خلف اور عاص بن وائل موجود تھے مشترکہ عبادت اور مشترک معبود کی تجویز رکھی کہ آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کریں اور ہم آپ کے معبود کی۔ آپ نے ان کی تجویز کے جواب میں سورہ کافرون سنادی اور ان کی تجویز کی حقیقت ان کو دکھلادی[۵۲]۔ ایک اہم مجلس قریش کا ذکر دعوت نبوی کے سلسلہ میں ضروری ہوجاتا ہے کیونکہ اسلام دعوت و تبلیغ کے لیے ایک اصول وقاعدہ بھی مقرر کرتا ہے اور اس کی صحیح سمت و رفتار بھی متعین کرتا ہے۔ ایک بار ولید بن مغیرہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ موجود تھا اور آپ اس سے کلام کر رہے تھے۔ آپ کو امید اور آرزو تھی کہ شاید وہ اسلام قبول کرلے۔ وہ قریش کے عظیم ترین سرداروں میں سے تھا اور اس کے قبول اسلام سے اسلام اور دعوتِ اسلامی کو مکہ مکرمہ میں بہت تقویت پہونچتی۔ اسی دوران حضرت ابن ام مکتوم جو نابینا مسلمان تھے آپ کی مجلس سے گذرے تو آپ سے کلام کرکے قرآن پڑھنے کی درخواست کرنے لگے۔ آپ کو بہت شاق گذرا کیونکہ ولید بن مغیرہ کے اسلام کی دعوت دینے میں خلل پڑا تھا۔ آپ نے اپنی ناگواری کا اظہار کیا تو حضرت ابن ام مکتوم مایوس چلے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فوراً سورہ عبس نازل کی اور آپ کو ہدایت کی کہ آپ کی دعوت کسی کے لیے خاص نہیں بلکہ عام ہے۔ جو چاہے اس کو منع نہ کریں اور جو نہ چاہے اس کے پیچھے اس طرح نہ پڑیں کہ خواہشمند نظرانداز ہوجائے[۵۳]۔ اس اصول دعوتِ اسلامی سے یہ واضح ہوتا ہے کہ داعی ہر حال میں

آرزومند مدعو کی رعایت کرے اور اس کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کرے، سماجی اور سیاسی لحاظ سے بڑے اور چھوٹے مدعوئین کے درمیان فرق نہ کرے اور بڑے کے لیے چھوٹے کو نظر انداز نہ کرے اور کسی کے استفسار و سوال پر ناگواری نہ محسوس کرے اور نہ اس کا اظہار کرے کہ دعوت اسلامی خوش خلقی، بردباری، حلم و تدبر اور ہمہ وقتی تیاری کا تقاضا کرتی ہے۔ اگرچہ متعدد دوسری مجالس قریشی کا ذکر مآخذ میں ملتا ہے مگر ان کا زیادہ تر تعلق دوسرے امور اور واقعات سیرت سے ہے۔ آخر میں ایک مجلس قریش کا ذکر مختصراً کرنا ضروری ہے کیونکہ اس میں حبشہ کے بیس نصاریٰ کے اسلام قبول کرنے کا ذکر ہے جو قریشی اکابر کی مجالس کے عین سامنے پیش آیا تھا۔[۵۹] دعوتِ اسلامی اور اس کی ترقی میں مجالس قریش نے کافی اہم کردار ادا کیا تھا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقۂ دعوت سے بہت فائدہ اٹھایا تھا۔

(باقی آئندہ)

تعلیقات وحواشی

۱؎ عبدالملک ابن ہشام (م ۲۱۸ھ)، سیرۃ النبی، مرتبہ محمد محی الدین عبدالحمید، دارالفکر قاہرہ ۱۹۳۷ء، اول ص ۲۵۹-۲۵۹ وما بعد؛ ابن سعد (م ۲۳۰ھ) الطبقات الکبریٰ، دار صادر بیروت ۱۹۵۷ء، اول ص ۱۹۹؛ بلاذری (م ۲۸۹ھ) انساب الاشراف، قاہرہ اول ۱۹۵۹ء، ص ۱۱۵-۱۰۸ نیز ملاحظہ ہو: مولانا شبلی، سیرت النبی، دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۸۳ء، اول ص ۲۰۶-۲۰۱؛ مولانا محمد ادریس کاندھلوی، سیرۃ المصطفیٰ، دارالکتاب دیوبند (غیر مورخہ)، اول ص ۱۵۴-۱۴۷ وما بعد؛ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، سیرت سرورِ عالم، ادارہ ترجمان القرآن لاہور ۱۹۸۰ء، دوم ص ۱۴۳-۱۶۲ اور ص ۵۱۲-۶۹۳

۲؎ ابن ہشام اول ص ۲۶۴-۲۶۷ نے اس موضوع پر سرے سے بحث ہی نہیں کی ہے۔ مولانا شبلی اول ص ۲۰۵-۲۰۱ نے بھی اس سے گریز کیا ہے۔ مولانا ادریس کاندھلوی، اول ص ۱۵۵-۱۴۷ نے بھی مولانا شبلی کا اتباع کیا ہے۔ مولانا مودودی، دوم ص ۱۴۶ نے لکھا ہے کہ "قبل از وقت مخالفت شروع ہو جاتی"۔

۳؎ خفیہ تبلیغ واشاعتِ اسلام کے سہ سالہ دور کے مصالح، اسباب اور مقاصد پر ابھی تک کوئی اہم تحقیقی اور مدلل کام نہیں ہوا۔ مآخذ و مصادرِ سیرت کے علاوہ کتبِ احادیث میں اس موضوع پر کافی مواد مل سکتا ہے

۴؎ اس موضوع پر صرف مولانا مودودی، دوم ص ۱۴۷ نے مفصل و مدلل بحث کی ہے "...... سورۂ علق کی پہلی پانچ آیات صرف یہ ظاہر کرتی تھیں کہ آپ پر نزول وحی کا آغاز ہو گیا ہے اور آپ اللہ کی طرف سے نبی بنا دیئے گئے ہیں۔ اب سورۂ مدثر کی ان آیات میں آپ کو نبوت کے ساتھ ساتھ فریضۂ رسالت بھی سونپ دیا

گیا اور حکم دیا گیا کہ آپ اٹھ کر اس فرض کو ادا کرنا شروع کر دیں۔" مفسرین نے بالعموم اس سورت کے ضمن میں تبلیغ نبوی کا ذکر کیا ہے۔ شاہ عبدالقادر دہلوی فرماتے ہیں: "یہ سورت اتری تب خلق کو دعوت کا حکم ہوا۔" مولانا مودودی کی عبارت حافظ ابن کثیر کے الفاظ کا ترجمہ ہے: "وبھذا حصل الارسال کما حصل بالاول النبوۃ" تفسیر القرآن، عیسی البابی الحلبی قاہرہ (غیر مورخہ) چہارم ص۴۴۲

۵۵ سورہ مدثر کی ابتدائی آیات ہیں: یا ایہا المدثر ۰ قم فانذر ۰ وربک فکبر ۰ وثیابک فطہر ۰ والرجز فاھجر ۰ ولا تمنن تستکثر ۰ ولربک فاصبر ۰ اے لحاف میں لپٹے! کھڑا ہو، پھر ڈر سنا، اور اپنے رب کی بڑائی بول، اور اپنے کپڑے پاک رکھ، اور گندگی کو چھوڑ دے، اور نہ کر کہ احسان کرے اور بہت چاہے اور اپنے رب کی راہ دیکھ۔ (ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی)

۵۶ مثال کے طور پر سورہ انعام ۱۵، ابراہیم ۴۴، شعراء ۲۱۴، مریم ۳۹ اور نوح ۱ وغیرہ میں آپ کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنی قوم اور تمام انسانوں کو انذار کریں۔ بنیادی طور سے یہ آپ کا فرض منصبی تھا کہ آپ رسول اللہ تھے لیکن امت مسلمہ پر یہ فرض امر بالمعروف کے ضمن میں عائد ہوتا ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح حکم کے تحت کہ میری جانب سے تبلیغ کرو خواہ ایک آیت کی ہو۔" اس لیے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں بھی یہ مسلمانوں کا فریضہ تھا اور آپ کی وفات کے بعد اس کی اہمیت دوچند ہو گئی ہے۔

۵۷ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں ذکر آتا ہے کہ انھوں نے حضرت خدیجہ کے ساتھ آپ کو نماز پڑھتے دیکھ کر استفسار کیا تو آپ نے فرمایا: "یہ اللہ کا دین ہے جس کو اس نے اپنے لیے پسند فرمایا ہے اور جس کے ساتھ اس نے اپنے رسول بھیجے ہیں۔ لہٰذا میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ اللہ وحدہ لاشریک کو مانو اور اس کی عبادت کرو اور لات و عزیٰ کا انکار کر دو۔" حضرت علی نے ایک رات توقف کے بعد اسلام دوسرے دن دوبارہ استفسار اور دعوتِ نبوی پر اسلام قبول کیا۔ ملاحظہ ہو: ابن اسحاق، کتاب المبتدا والمبعث والمغازی، مرتبہ محمد حمید اللہ، اردو ترجمہ نور الٰہی ایڈووکیٹ، نقوش رسول نمبر ۱۱، لاہور ۱۹۸۵ء، باب ۱۶ ص۱۴۰؛ ابن کثیر۔
مولانا مودودی، دوم ص۱۴۴-۵؛ ادریس کاندھلوی، اول ص۱۵۵ دونوں نے ابن کثیر کی البدایہ کا حوالہ دیا ہے۔

ابن اسحاق کے تہذیب و تلخیص کرنے والے ابن ہشام نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت علی کے نماز پڑھنے کا ذکر کیا ہے اور ایمان لانے کا بھی مگر دعوتِ نبوی کی مذکورہ بالا روایت و دعوت کا ذکر نہیں کیا۔ ملاحظہ ہو ابن ہشام اول ص۲۶۴-۵۔ مولانا شبلی اول ص۲۰۵ نے نبوی دعوت پر حضرت علی کے ایمان لانے کا یہ واقعہ نہیں بیان کیا۔

حضرت زید بن حارثہ کلبی کے اسلام قبول کرنے کے حالات و واقعات اور دعوتِ نبوی کا ذکر نہیں ملتا۔ غالباً وہ بھی حضرت علی کی مانند اسلام لائے ہوں گے جیسا کہ مولانا مودودی دوم ص۱۴۵ کا خیال ہے۔ دوسرے

سیرت نگاروں نے ان کے قبول اسلام کا ذکر ضرور کیا ہے ملاحظہ ہو ابن ہشام اول ص۲۶۵ ؛ مولانا شبلی، اول ص۲۰۵ ؛ ادریس کاندھلوی، اول ص۱۵۶ ۔

۸۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں یہ صراحت ملتی ہے کہ اولین وحی کی تنزیل کے بعد ہی بلا دعوت مسلمان ہوگئی تھیں اور اولین مسلم تھیں۔ ملاحظہ ہو: ابن اسحاق ص۱۲۰-۱۳۱ ؛ ابن ہشام اول ص۲۵۷-۲۵۹ ؛ مولانا شبلی، اول ص۲۰۵ ؛ ادریس کاندھلوی، اول ص۱۵۴-۱۵۵ ؛ مودودی دوم ص۱۴۳ ۔

۹۔ زرقانی نے شرح مواہب میں لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر حضرت خدیجہ کے بھتیجے حکیم بن حزام اسدی کے گھر بیٹھے تھے کہ اسی دوران حضرت حکیم کی باندی نے آکر خبر دی کہ حضرت خدیجہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰ کی مانند اللہ کا نبی بتاتی ہیں۔ حضرت ابوبکر نے یہ سن کر خدمتِ نبوی میں حاضری دی اور بلا تامل ایمان لے آئے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکر نے آپ سے ملاقات کرکے آپ کی نبوت و رسالت کی تصدیق چاہی تو آپ نے فرمایا..... "بیشک میں اللہ کا رسول اور اس کا نبی ہوں تاکہ اس کا پیغام پہونچاؤں۔ میں تمہیں بھی اللہ کی طرف سچائی کے ساتھ دعوت دیتا ہوں۔ بخدا یہ دعوت برحق ہے۔ اے ابوبکر! میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ تم ایک اللہ کو مانو جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے سلسلے میں اہلِ اطاعت کی امداد کرو۔" آنحضرت نے حضرت ابوبکر کو قرآن بھی پڑھ کر سنایا۔ حضرت ابوبکر نے تردد کیا نہ انکار بلکہ فوراً اسلام قبول کرلیا....." ملاحظہ ہو ابن اسحاق، ص۱۳۲ ؛ زرقانی (م ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء) شرح المواہب اللدنیہ والمنح المحمدیہ للقسطلانی، طبع بولاق ۱۸۶۲ء بحوالہ سید مودودی، دوم ص۱۴۵۔ جبکہ مولانا شبلی، اول ص۲۰۵ ؛ ادریس کاندھلوی، اول ص۱۵۶-۱۵۸ نے ابن ہشام اول ص۲۶۶-۲۶۸ کی متابعت میں حضرت ابوبکر کے قبول اسلام کا ذکر تو کیا ہے اور عام دعوتِ نبوی کا بھی لیکن اس کی تفصیل نہیں دی خاص کر دعوتِ نبوی کا یہ واقعہ نہیں بیان کیا ہے۔

۱۰۔ حضرت ابوبکر صدیق کے قبولِ اسلام کے ضمن میں ابن اسحاق کا بیان کردہ دعوتِ نبوی کا آخری جملہ توجہ طلب ہے جو دوسرے الفاظ میں اور دوسری مادی اور اخلاقی امداد کے علاوہ تبلیغ و اشاعتِ اسلام میں ان کے کارگذار و کارگر تعاون کو طلب کرنے کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے اور ان کا فریضہ ایمانی بھی قرار دیتا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق نے اسی فریضہ کے احساس اور ایمانی جذبہ کے تحت اپنے دوستوں کو دعوت دی اور بقول ابن اسحاق ان کی تبلیغ سے متاثر ہوکر حضرات زبیر بن عوام (اسدی)، عثمان بن عفان (اموی) طلحہ بن عبید اللہ (عدوی) سعد بن ابی وقاص (زہری) اور عبدالرحمٰن بن عوف (زہری) نے اسلام قبول کرلیا۔ یہ سب حضرات حضرت ابوبکر کی معیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے۔ آنحضرت نے

انھیں قرآن سنایا اور اسلام کی حقیقت سے روشناس کیا نیز اللہ کی طرف سے نوازشات کے وعدوں کی بشارت دی چنانچہ وہ ایمان لے آئے اور اسلام کی حقانیت کا اقرار کرنے والے بن گئے۔" ابن اسحاق ص۱۴۳، ابن ہشام اول ص۲۶۸ نے دعوتِ نبوی کے بارے میں کچھ نہیں کیا ہے۔

نیز ملاحظہ ہو مولانا شبلی اول ص۲۰۶؛ مولانا ادریس کاندھلوی، اول ص۱۵۸؛ مولانا مودودی، دوم ص۱۵۴۔ موخرالذکر نے دعوت و تبلیغ صدیق اور اس کے نتیجہ میں اچھی خاصی تعداد کے مسلمان ہونے کا ذکر کیا ہے تاہم مذکورہ بالا پانچ صحابہ کرام کا نام نہیں لیا ہے۔

۱۱ مولانا مودودی، دوم ص۱۵۴ فرماتے ہیں: "ان (حضرت ابوبکر) کی قوم کے لوگ ان کے علم، ان کی تجارت اوران کے عمدہ برتاؤ کی وجہ سے بکثرت ان سے ملتے اوران کے پاس آکر بیٹھتے تھے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاکر انھوں نے جن جن لوگوں پر اعتماد کیا ان تک دعوت پہونچائی اورایک اچھی خاصی تعداد ان کی تبلیغ سے متاثر ہوکر مسلمان ہوگئی.... "

۱۲ مولانا مودودی اسی سلسلۂ بالا میں متصلاً فرماتے ہیں کہ.... "پھر جو جو مسلمان ہوتا گیا وہ آگے اپنے حلقۂ احباب میں نیک روحوں کو تلاش کرکرکے اندر ہی اندر اسلام پھیلاتا گیا۔"

سید مودودی ہی وہ واحد سیرت نگار ہیں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تین بناتِ مطہرات۔ حضرت زینب، حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "تاریخ وسیرت کی کتابوں میں انھیں ابتدائی چار مسلمانوں کا نام لیا جاتا ہے لیکن یہ فرض نہیں کیا جا سکتا کہ حضور کی جو صاحبزادیاں اس وقت ہوشمندی کی عمر کو پہونچ چکی تھیں وہ اپنی والدۂ ماجدہ کے ساتھ ایمان نہ لائی ہوں گی..." اس پر یہ اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ بناتِ مطہرات حضرت خدیجہ کی دعوت پر اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت وشخصیت کے سبب اسلام لائی تھیں۔ ملاحظہ ہو سید مودودی دوم ص۱۴۳-۱۴۴ حاشیہ ۱ از مولف۔

۱۳ ابن سعد، چہارم ص۹۴-۹۵ نے حضرت خالد بن سعید اموی کے قبول اسلام کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کی تلخیص کے لیے ملاحظہ ہو: مولانا ادریس کاندھلوی، اول ص۱۶۳-۱۶۵ جو لکھتے ہیں کہ حضرت خالد بن سعید اموی نے ایک خواب دیکھا کہ وہ اُن کا باپ ان کو ایک آگ سے بھری خندق میں ڈھکیل رہا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اچانک پہونچ کر بچا لیتے ہیں۔ انھوں نے یہ خواب حضرت ابوبکر صدیق سے بیان کیا اور حضرت صدیق نے ان کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا مشورہ دیا۔ تعمیل میں جب وہ خدمت نبوی میں حاضر ہوئے تو آپ نے مختصراً یہ دعوت دی: "میں تم کو اللہ وحدہ لاشریک کی طرف بلاتا ہوں اور کہتا ہوں کہ محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور اس کی بھی دعوت =

دیتا ہوں کہ پتھروں کی عبادت جو تم کرتے رہے ہو چھوڑ دو کہ وہ نہ نقصان پہونچاتے ہیں اور نہ نفع اور نہ یہ جانتے ہیں کہ کون ان کی عبادت کرتا ہے اور کون نہیں کرتا۔"

۱۴؎ ابن حجر عسقلانی، الاصابہ اول ص۳۲۷، مولانا ادریس کاندھلوی، اول ص۱۶۵۔

۱۵؎ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، سوم ص۳۹۳ میں دعوت وتبلیغ صدیقی کا ذکر نہیں ہے۔ مولانا ادریس کاندھلوی اول ص۱۶۸

۱۶؎ ابن سعد، چہارم ص۲۴۳ ومابعد نے دارارقم میں قیام نبوی سے قبل ان کے اسلام کا ذکر کیا ہے۔

ابن اثیر، اسد الغابہ، سوم ص۴۱۴-۴۱۵؛ ابن حجر، اصابہ، قاہرہ ۱۹۳۹ء اول ص۲۳۹-۲۴۰ پر اس کا ذکر نہیں ہے۔ مولانا ادریس کاندھلوی، اول ص۱۶۰-۱۶۱۔ ابن عبدالبر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، برحاشیہ اصابہ مذکورہ بالا، اول ص۲۱۱-۲۱۲ پر ان کے اسلام لانے کا واقعہ منقول نہیں ہے۔

۱۷؎ ابن اثیر، اسد الغابہ، سوم ص۴۱۴-۴۱۵؛ ابن عبدالبر، الاستیعاب برحاشیہ اصابہ قاہرہ ۱۹۳۹ء، سوم ص۱۶۳-۱۶۵، ادریس کاندھلوی، اول ص۱۶۱-۱۶۲، بحوالہ عیون الاثر۔

۱۸؎ ابن سعد، طبقات، سوم ص۲۲۷ ان دونوں حضرات نے پینتیس ۳۵ مسلمانوں کے بعد اسلام قبول کیا تھا، نیز سوم ص۲۴۷-۲۴۸، ادریس کاندھلوی، اول ص۱۶۸-۱۶۹۔

۱۹؎ مکہ مکرمہ کے سابقین اولین میں ممتاز ترین حضرات وخواتین جو اس زمرہ میں آتی ہیں ان میں حضرات بلال بن رباح حبشی، حضرت یاسر، حضرت سمیہ، حضرت عمار، حضرت زنیرہ، حضرت ام عبیس، حضرت نہدیہ وغیرہ۔

یہ عجیب بات ہے کہ زیادہ تر کمزور مسلمانوں (مستضعفین) کے قبول اسلام کے حالات واسباب کا ذکر نہیں ملتا۔

۲۰؎ ابن اسحاق ص۱۴۴؛ بخاری، کتاب : قصہ اسلام ابی ذر۔ ابن سعد، چہارم ص۲۱۹-۲۲۵، ادریس کاندھلوی، اول ص۱۷۰-۱۷۱؛ سید مودودی، دوم ص۵۳۷-۵۳۸۔

سید جلال الدین عمری، "رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوتی مکاتیب" تحقیقات اسلامی، علی گڑھ جلد۷ شمارہ ۲ (اپریل جون ۱۹۸۸ء) ص۵ کا یہ بیان کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ میں تھے اسلام کی دعوت عام نہ ہوسکی۔ قریش کے ظلم وستم نے اس کی راہ میں زبردست رکاوٹیں کھڑی کر رکھی تھیں"، صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اسی مکی دور میں اسلام مکہ مکرمہ سے نکل کر جنوب میں اشعر، دوس وغیرہ، مغرب میں بحرین تک اور شمال میں مدینہ اور اس سے پرے تک معروف ہوچکا تھا۔

۲۱؎ ابن سعد، چہارم ص۱۰۵ حضرت موسیٰ اشعری، ص۱۱۶-۱۱۷ حضرت معیقب بن ابی فاطمہ دوسی ص۲۳۷ حضرت طفیل بن ازدی کے لیے۔ ان کے بارے میں وضاحت ملتی ہے کہ وہ جب مکہ آئے تو قریشی اکابر نے ان کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی برائی کرکے آپ سے ملاقات کرنے سے منع کیا۔ حضرت طفیل اس قدر متاثر ہوئے

کہ مسجد حرام جاتے تو کانوں میں روئی ڈال لیتے کہ آپ کا کلام سن نہ لیں۔ بعد میں خیال آیا کہ وہ کوئی بچہ نہیں، صاحبِ عقل و شعور آدمی اور ذہین و فطین شاعر ہیں، سننا تو چاہئے کہ آپ کہتے کیا ہیں؟ چنانچہ آپ کا پیچھا کرتے ہوئے آپ کے گھر میں داخل ہوئے اور آپ کی دعوت کے بارے میں پوچھا۔ آپ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا اور قرآن کریم کی آیات تلاوت کیں۔ پھر وہ مسلم تھے۔ آپ نے ان کو اسلام کی تبلیغ کرنے کے لیے مامور کیا اور قبیلہ دوس کے کافی لوگوں کو مسلمان کیا۔

۲۲ھ قدیم مآخذ میں اس موضوع پر کوئی واضح روایت نہیں ملتی۔ ابن سعد نے کئی جلدوں میں اس مرکز اسلامی کا ذکر کیا ہے لیکن تاریخ کوئی نہیں دی۔

مولانا ادریس کاندھلوی اول ص ۱۷۱ کا خیال ہے کہ "مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی جماعت ہوگئی تو حضرت ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مکان جمع ہونے کے لیے تجویز ہوا" مولانا مودودی، دوم ص ۱۵۳-۱۵۴ کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کے آنے کے ڈھائی سال سے کچھ زیادہ مدت گذری تھی کہ کچھ مکی مسلمان چھپ کر مکہ کی ایک گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ مشرکین کے ایک گروہ نے ان کو دیکھ لیا اور سخت سست کہا جس پر بات بڑھ گئی اور حضرت سعد بن ابی وقاص نے ایک شخص (عبداللہ بن خطل ادرمی) کو بڑی مار کر زخمی کر دیا۔" اس کے بعد حضور نے بلا تاخیر حضرت ارقم بن ابی ارقم کے مکان کو جو صفا کے قریب واقع تھا مسلمانوں کے اجتماع اور دعوت و تبلیغ کا مرکز بنا دیا۔"

مولانا مودودی نے مشرکین کے زخمی ہونے والے شخص کو "بنی تیم کا عبداللہ بن خطل قرار دیا ہے۔ عبداللہ بن خطل کا تعلق قریش الظواہر کے خاندان بنو ادرم / بنو تیم بن غالب سے تھا نہ کہ صرف بنو تیم سے۔ کیونکہ صرف بنو تیم سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ وہ حضرت ابوبکر صدیق کا خاندان تھا۔ ملاحظہ ہو مصعب زبیری، کتاب نسب قریش، مرتبہ لیفی بروفنیسال، دار المعارف قاہرہ ۱۹۵۳ء، ص ۴۳۱-۴۴۲۔

جدید مورخین اور سیرت نگاروں میں مستشرق ولیم مونٹگمری واٹ (W. Montgomery Watt) نے دار ارقم کے مرکز اسلامی یا مقام نبوی بنائے جانے کی تاریخ / زمانہ ۶۱۴ء قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو اردو معارف اسلامیہ دانش گاہ پنجاب لاہور (مقالہ الارقم)۔ اس اعتبار سے وہ علانیہ دعوت کے زمانے کا واقعہ بنتا ہے نہ کہ خفیہ دور تبلیغ کا۔ خاکسار نے بھی یہی غلطی کی ہے ملاحظہ ہو 'عہد نبوی میں تنظیم ریاست و حکومت' القاضی پبلشرز نئی دہلی ۱۹۸۸ء ص ۸۰ جو واٹ کی تاثر پذیری کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

۲۳ھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مکان "الدار الرقطاء" نامی مقام / محلہ میں واقع تھا جو مسجد حرام / کعبہ کے میں مسعیٰ (سعی کرنے کی جگہ جو صفا اور مروہ کے دو پہاڑوں کے درمیان واقع تھا) کی سمت میں تھا۔ آپ کے بدقماش پڑوسیوں میں ابولہب ہاشمی، حکم اموی، عقبہ بن ابی معیط اموی، عدی بن حمراء ثقفی

اور ابن الاصدار ہذلی کے نام آتے ہیں۔ قرب وجوار میں ابن ابی حسین، عباس بن عبدالمطلب ہاشمی، ابن ازہر زہری اور اخنس بن شریق کے مکانات واحاطے تھے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو خاکسار کا مضمون "معیشت نبوی ۔ مکی عہد میں"۔ تحقیقات اسلامی، علی گڑھ جلد ۹ شمارہ ۳ (جولائی ستمبر ۱۹۹۰ء) ص ۹-۳۸۔ حوالہ کے لیے ابن ہشام، اول ص ۳۶۹ وغیرہ۔ بدقماش پڑوسیوں کے لیے ملاحظہ ہو ابن سعد، اول ص ۲۰۱ وغیرہ۔

۲۴ء دارارقم کے جائے وقوع کے بارے میں ہمارے عام سیرت نگاروں نے مختلف بیانات دئے ہیں جن سے غلط فہمی اور الجھن پیدا ہوتی ہے۔ ابن اسحاق ص ۱۹۱ اور ابن ہشام اول ص ۳۶۶ کا بیان ہے کہ وہ صفا پہاڑی کے قریب (فی بیت عند الصفا) تھا۔ مولانا شبلی، اول ص ۲۲۵ کا بیان ہے کہ "حضرت ارقم کے مکان میں جو کوہ صفا کی تلی میں واقع تھا۔" مولانا ادریس کاندھلوی، اول ص ۱۷۱، کوہ صفا پر آپ کا مکان تھا۔" مولانا مودودی، دوم ص ۱۵۵ کے خیال میں "کوہ صفا کے قریب تھا" مشہور مستشرق مونٹگمری واٹ کا خیال ہے کہ وہ کوہ صفا پر واقع تھا اردو معارف اسلامیہ دانش گاہ پنجاب لاہور (مقالہ الارقم)

ابن سعد، سوم ص ۳-۲۴۲ کے مطابق وہ کوہ صفا پر واقع تھا۔ وہ عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور (۱۳۶-۱۵۸ھ / ۷۵۴-۷۷۵ء) کے عہد تک موجود تھا۔ اس سلسلہ میں ابن سعد کی ایک اور روایت اس کے جائے وقوع کی صراحت کرتی ہے۔ خلیفہ منصور جب حج کے لیے مکہ مکرمہ پہونچے تو وہ صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے لگے۔ راوی کا بیان ہے کہ اس وقت ہم لوگ دار (ارقم) کی چھت (ظہر) پر ایک خیمہ میں موجود تھے۔ خلیفہ ہمارے نیچے سے گذرتے اور وہ اتنے قریب ہوتے کہ اگر میں ان کی ٹوپی (قلنسوہ) اتارنا چاہتا تو آسانی سے اتار لیتا۔ وہ وادی کی تلی (بطن) سے صفا کی طرف چڑھتے ہوئے ہماری طرف دیکھتے رہتے تھے۔" نیز ابن سعد، سوم ص ۲۶۸ پر اس کو اصل الصفا میں واقع ہونا بتایا ہے۔

۲۵ء مذکورہ بالا تمام مورخین و سیرت نگاروں کے ہاں دارارقم میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مستقل قیام/سکونت کا واضح یا مضمر ذکر ملتا ہے جو بظاہر صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ رازداری اور خفا کا مقصد اس صورت میں فوت ہو جاتا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کوئی غیر معروف داعی اور مصلح نہ تھے بلکہ مکہ مکرمہ کے معروف و معتبر شخص تھے اور مکہ کے متعدد افراد و خاندان سے آپ کے سماجی اور تجارتی تعلقات تھے اس لیے اپنے سکونتی مکان سے آپ مستقل غیر حاضری یا دوسرے مکان میں مستقل سکونت مسائل پیدا کر سکتی تھی۔ یہ بحث طلب اور تحقیق طلب باب سیرت ہے جس پر ابھی مفصل و مدلل کام نہیں ہوا۔ ملاحظہ ہو خاکسار کا آئندہ مضمون "دارارقم ۔ اولین مرکز اسلامی"۔

۲۶ء مولانا ادریس کاندھلوی، اول ص ۱۷۱ کا خیال ہے کہ حضرت عمر کے اسلام لانے تک رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام وہیں جمع ہوتے تھے حضرت عمر کے اسلام لے آنے کے بعد جہاں چاہتے جمع ہوتے"
(بحوالہ اصابہ اول ص۲۸۵)

مولانا مودودی دوم ص۱۵۵ فرماتے ہیں کہ تین سال کی خفیہ دعوت کا دور ختم ہونے اور علانیہ دعوت عام شروع ہوجانے کے بعد بھی یہ مسلمانوں کا مرکز رہا۔ اسی میں حضور تشریف فرما رہتے تھے.... اور شعب ابی طالب کی محصوری تک.... اسی کو دعوتِ اسلام میں مرکزی حیثیت حاصل رہی۔"

بہرحال ابن سعد، سوم ص۲۴۲-۳ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شروع اسلام میں دار ارقم میں ہوا کرتے تھے (کان یکون)

۲۷ھ ابن سعد، سوم ص۵۱، ص۵۵، ص۸۴، ص۸۹، ص۱۱۶

۲۸ھ ابن سعد، سوم ص۲۲۷ ۲۹ھ ابن سعد، سوم ص۲۲۲، ص۳۸۸، نیز ص۱۲۳

۳۰ھ ابن سعد، سوم ص۲۱۵ ۳۱ھ ابن سعد، سوم ص۱۵۰-۱

۳۲ھ ابن اسحاق ص۱۴۸-۹؛ ابن ہشام اول ص۲۷۴

نیز ملاحظہ ہو شبلی نعمانی، اول ص۲۱۰؛ ادریس کاندھلوی، اول ص۱۴۲ نے ابن اسحاق کی پیروی کی ہے؛ سید مودودی دوم ص۴۹۵ نے قریب ترین رشتہ داروں کو دعوتِ عام دینے میں صرف ایک آیت سورہ شعراء ص۲۱۴ کا ذکر کیا ہے۔

۳۳ھ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: بلاذری، انساب الاشراف، اول ص۱۱۹ کے مطابق آپ نے بنو عبد مناف کو دوسری مجلس میں مخاطب کرکے فرمایا تھا: "اللہ کی قسم جس کے سوا اور کوئی معبود و الٰہ نہیں، میں تمہاری طرف خاص کر اور سارے انسانوں کے لیے عام طور سے اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں...."

۳۴ھ سید مودودی، پاک ص۵-۴۹۳ نے اس سلسلہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم میں نماز پڑھنے اور ابوجہل مخزومی کے رکاوٹ ڈالنے کا ذکر کیا ہے اور آخر میں قریش کے دوسرے لوگوں کے ہجوم کرنے کو بھی سورہ جن ۱۹ کے حوالے سے بیان کیا ہے اور تفسیر و حدیث کی متعدد روایات و کتب کا حوالہ دیا ہے۔

۳۵ھ ابن ہشام اول ص۳۶۸-۹

۳۶ھ ابن ہشام اول ص۳۶۸-۹ نے ابن اسحاق کی ایک دوسری روایت حضرت عمر بن خطاب کے قبولِ اسلام کے بارے میں یہ بیان کی ہے کہ ایک شام جب وہ طوافِ کعبہ کرنے پہونچے تو آپ کو نماز پڑھتے ہوئے پایا۔ وہ اپنی یہ خواہش کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت سنیں چھپا نہیں پائے اور غلاف کعبہ میں =

چھپ کر سننے لگے۔ حضرت عمر کا بیان ہے کہ جب میں نے آپ سے قرآن سنا تو میرے دل میں رقت پیدا ہوئی اور میرے دل میں اسلام بھی داخل ہو گیا اور میں خوب رویا۔ مسجد حرام/ کعبہ سے آپ کی واپسی پر آپ کا پیچھا کیا اور راستہ میں اسلام قبول کیا۔ ابن اسحاق کا تبصرہ بھی نقل کیا ہے کہ اللہ جانے کہ ان میں سے کون سی روایت صحیح ہے۔ اس روایت میں تلاوت قرآن کی تاثیر کا ذکر بالکل صحیح ہے جس کی تائید دوسری روایات سے ہوتی ہے۔

سید مودودی، دوم ص۶-۷ نے حضرت عمر کے اولین تاثر کے سلسلہ میں ابن اسحاق کی مذکورہ بالا روایت ذرا مختلف انداز میں مسند احمد اور طبرانی سے نقل کی ہے جس میں ان کے سورہ حاقہ کی تلاوت سننے کی تصریح ہے۔ حاشیہ میں مسند ابن سنجر کا مؤلف نے اضافہ کیا ہے۔ اس میں اسلام کے ان کے دل میں گہرا اترنے کا واضح ذکر ہے اگرچہ قبول اسلام کا ذکر نہیں ہے۔

اسلام عمر کے بارے میں مشہور عام روایت جو زیادہ تر سیرت نگاروں نے نقل اور قبول کی ہے اس میں بھی حضرت عمر کے قرآن سے متاثر ہونے اور اسی کے تحت اسلام قبول کرنے کا صریح ذکر ہے۔ ملاحظہ ہو: ابن ہشام اول ص۳۶۵-۳۶۶؛

۳۷ ابن اسحاق ص۱۹۷-۱۹۹، ص۲۱۶-۲۱۷ نے سورہ اسراء/ بنی اسرائیل ۱۱۰ کی تفسیر میں واقعہ مندرجہ ذیل نہیں لکھا ہے لیکن روایت میں لکھا ہے۔ ابن ہشام، اول ص۳۳۷ کا بیان ہے کہ مذکورہ بالا تینوں اکابر قریش نے الگ الگ یہ فیصلہ کیا کہ رات میں جب آپ اپنے گھر میں نماز میں تلاوتِ قرآن کرتے ہیں تو اس کو سنا جائے۔ وہ چھپ کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ رہے اور رات بھر آپ کی تلاوت سنی۔ طلوع فجر کے وقت جب وہ واپسی کے لیے چلے تو راستہ میں مڈبھیڑ ہو گئی اور ایک نے دوسرے کو لعنت ملامت کرتے اور جدا ہو جاتے۔ ان کے دل اسلام کی طرف متوجہ ہو چکے تھے لیکن حسد و طغیان اور خاندانی زعم و غرور میں قبولیت کے لیے زبانیں نہ کھلیں۔

۳۸ ابن ہشام اول ص۳۳۶ نے قرآن مجید کی سورہ بنی اسرائیل ۱۱۰ کے حوالہ سے آپ کی تلاوت نماز کا ذکر کیا ہے اور حضرت عبداللہ بن عباس کی یہ تفسیر بیان کی ہے کہ نہ اتنی زور سے نماز میں تلاوت کریں کہ لوگ چھٹ جائیں اور اتنی پست آواز میں پڑھیں کہ جو سننا چاہتے ہیں وہ سن نہ سکیں۔ ممکن ہے کہ چوری چھپے سننے والوں میں سے کوئی ان آیات کریمہ کو کسی ایسے تک پہونچا دے جو اس سے نفع پائے۔ اس پر یہ اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ شاید سننے والوں میں سے ہی کسی کو فیض پہونچے جیسا کہ حضرت عمر کے سلسلہ میں ہوا تھا۔ نیز ابن ہشام اول ص۳۳۵-۳۳۷، تعلیقہ مذکورہ بالا نیز ملاحظہ ہو تفسیر آیتِ بالا کے لیے تفاسیر قرآن کریم خاص کر ابن کثیر، تفسیر القرآن، جلد سوم ص۶۸-۶۹

۳۹ ابن ہشام، اول ص۳۳۶-۳۳۷ کا بیان ہے کہ ایک دن اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم جمع ہوئے تو یہ معاملہ زیر بحث آیا کہ قریش نے اس قرآن کریم کو کبھی علانیہ اور جہری تلاوت کے ذریعہ نہیں سنا ہے تو کون انھیں سنائے گا؟

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جب اپنا نام پیش کیا تو صحابہ کرام نے ان کے بارے میں خدشہ ظاہر کیا اور کہا کہ ہم تو ایک صاحب عزت وجاہ اور خاندان والے کو چاہتے ہیں کہ مبادا قریش کے اکابر دستِ ظلم دراز کریں تو وہ ان کی حمایت وحفاظت کر سکے۔ لیکن حضرت ابن مسعودؓ نے اللہ تعالیٰ کی حمایت ونصرت کے بھروسے پر یہ کام کر ڈالا۔

۴۰ھ ابن اسحاق ص۳-۲۵۲ کی اس روایت میں کافی اختلاف ہے مثلاً حضرت ابوبکر کی مسجد کو ان کے گھر کے صحن میں واقع ہونا بتایا گیا ہے۔ ابن ہشام، اول ص۶-۳۹۴۔ قریش کے لوگ اس تلاوت قرآن سے اپنے متعلقین کو فتنہ میں مبتلا ہونا مراد لیتے ہیں۔

۴۱ھ ابن اسحاق ص۹-۱۴۸؛ بلاذری، انساب الاشراف اول ص۹-۱۱۸۔ بلاذری کی اس روایت میں آپ کے دعوتی خطبہ کے بڑے مؤثر الفاظ نقل کیے گئے ہیں۔ اور ابوطالب کی حمایت نبوی کے علاوہ قوم کے کلام لین کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کے بعد متصلاً دوسری روایت میں حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب اور ابولہب بن عبدالمطلب کی رسالت نبوی کے بارے میں گفتگو نقل کی گئی ہے کہ وہ تصدیق کرتی تھیں اور وہ تکذیب کرتا تھا۔

اصلاً یہ دونوں واقدی کی روایت ہیں اور ان میں روایتی لحاظ سے کلام ہو سکتا ہے لیکن مغزِ کلام اور متن روایت میں اسلامی روایت کے مطابق ہے۔

۴۲ھ ابن اسحاق ص۱۵۰ نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اولاد عبد مناف! اے اولاد عبدالمطلب! اے فاطمہ محمدؐ کی بیٹی! اے صفیہ رسول اللہ کی پھوپھی! تم لوگ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بچاؤ کیونکہ میں اللہ کی گرفت سے تم کو بچانے کا کوئی اختیار نہیں رکھتا... یہ کافی مفصل حدیث ہے۔

یہ حدیث وروایت صحیح کتب احادیث میں بھی ملتی ہے۔ ملاحظہ ہو بخاری، صحیح، کتاب التفسیر، سورہ تبت یدا وغیرہ نیز حاشیہ وتعلیقہ ۴۳ھ۔

۴۳ھ بخاری صحیح، کتاب التفسیر، سورۃ الشعراء، سورۂ سبا، سورہ تبت یدا؛ کتاب احادیث الانبیاء باب من انتسب الی آبائہ؛ صحیح مسلم، باب وانذر عشیرتک الاقربین، کتاب الایمان۔ حیرت ہے کہ ابن اسحاق وابن ہشام نے کوہ صفا سے خطاب نبوی کا ذکر نہیں کیا۔ ملاحظہ ہو: ابن اسحاق، ص۵-۱۴۸؛ ابن ہشام اول ص۵-۲۷۴؛ البتہ بلاذری اول ص۵-۲۷۴؛ البتہ بلاذری اول ص۱-۱۱۹ نے کوہ صفا سے خطاب ودعوتِ نبوی کی تین روایات اپنے تین مختلف شیوخ سے نقل کی ہیں مگر ان تینوں کے آخری راوی ایک ہی حضرت ابن عباس ہیں۔ ان تینوں میں خطاب نبوی کے الفاظ ودعوت کے علاوہ بعض دوسرے اختلافات بھی ہیں جو ان کو تین مختلف مواقع کا خطاب بھی بنا سکتے ہیں اگرچہ عام طور سے ان کو ایک ہی واقعہ کی تین مختلف تعبیرات قرار دیا جاتا ہے۔

سورۂ شعراء ۳ میں ارشاد ربانی ہے: لعلک باخع نفسک الا یکونوا مومنین (شاید تو=

گھونٹ مارے اپنی جان اس پر کہ وہ یقین نہیں کرتے) ابن کثیر، تفسیر القرآن، سوم ص۲۳۱ نے اس کو آپ کے لیے تسلی ربانی قرار دیا ہے۔ یہ صحیح ہے مگر اس میں آپ کی جاں سوز تبلیغ کا اعلان بھی ہے۔

۴۴ه ابن اسحاق ص۱۵۱ اور ص۲۲۹؛ ابن ہشام دوم ص۳۲-۳۱، ابن کثیر۔ سید مودودی، دوم ص۶-۵۰۲

۴۵ه ابن کثیر، تفسیر القرآن، چہارم ص۹-۵۲۸؛ شاہ عبدالقادر دہلوی، موضح القرآن ف ا ص۳-۱۰۰؛

اس پر مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو سید مودودی، دوم ص۴-۴۹۳۔

ابن ہشام اول ص۳۳۳ نے النادی کی یہ تعریف کی ہے: وہ مجلس جس میں قوم جمع ہوتی اور اپنے امور پر بحث کرتی ہے اور حوالہ میں قرآن مجید سورہ عنکبوت ۲۹ وتاتون فی نادیکم المنکر (اور کرتے ہو اپنی مجلس میں برا کام) اور عبید بن الابرص کے شعر کے علاوہ بعض دوسری آیات قرآنی مریم ۷۳ اور اقرأ ۱۷ سے استشہاد کیا ہے۔

۴۶ه ابن اسحاق اور ابن ہشام نے ان قریشی مجالس کا ذکر متعدد مواقع پر کیا ہے۔ عہد جاہلیت میں ان کا ایک ذکر جناب عبداللہ بن عبدالمطلب ہاشمی کی قربانی کے ضمن میں آیا ہے۔ جبکہ جناب عبدالمطلب بن ہاشم کی مجلس کا مفصل ذکر ملتا ہے جس میں ان کے فرزند ان کی مسند کے حاشیہ پر بیٹھا کرتے تھے مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بچپن کے زمانے میں اس مجلس خاص میں مسند جد امجد پر بیٹھنے کی اجازت حاصل تھی۔ ملاحظہ:

ابن ہشام قاہرہ ۱۹۵۵ء، اول ص۳-۱۵۲ اور ص۱۶۸ وغیرہ؛ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ اول ص۲۳۹

حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی کے قبول اسلام کے ضمن میں ابن ہشام نے ایک اہم مجلس قریش کا ذکر کیا ہے۔ اس تاریخ ساز دن ابوجہل مخزومی نے کوہ صفا کے پاس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر آپ سے سخت بدتمیزی کی اور پھر جا کر خانہ کعبہ کے پاس قریش کی ایک مجلس (نادی) میں جا بیٹھا۔ حضرت حمزہ نے شکار سے واپسی پر معمول کے مطابق طواف کیا اور قریش کی ہر مجلس کے قریب ٹھہرے، اہل مجلس کو سلام کیا اور ان سے کلام کیا۔ جب واپس ہوئے تو عبداللہ بن جدعان کی ایک باندی نے ابوجہل مخزومی کی بدتمیزی اور بدکلامی کا ذکر ان سے کر دیا۔ حضرت حمزہ غصہ سے بھر گئے اور واپس جا کر بھری مجلس میں نہ صرف اپنی کمان سے ابوجہل کی مرمت کر دی بلکہ اپنے اسلام کا اعلان بھی کر دیا۔ ملاحظہ ہو ابن ہشام اول (قاہرہ ۱۹۵۵ء) ص۲-۲۹۱؛ ابن اسحاق ص۸-۱۷۹۔

۴۷ه ابن اسحاق ص___؛ ابن ہشام اول ص۴-۳۱۳۔

۴۸ه ابن اسحاق ص۹-۲۰۸؛ ابن ہشام اول ص۹-۳۱۵۔

۴۹ه ابن اسحاق ص۱۲-۲۱۱؛ ابن ہشام، اول ص۲۰-۳۱۹۔

۵۰ھ ابن اسحاق، ص۲-۲۱۳؛ ابن ہشام اول ص۳۵-۳۲۰۔ ابن اسحاق کی یہ روایت بہت مختصر ہے جبکہ ابن ہشام کے ہاں کافی تفصیل ہے۔

۵۱ھ ابن ہشام اول ص۳-۲۸۲؛ ابن اسحاق ص۱-۲۰۸

۵۲ھ ابن ہشام، اول ص۳۸۶ کا بیان ہے کہ یہ بحث مباحثہ دوران طواف نبوی ہوا تھا۔ لیکن اس کا صحیح مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملاقات تو دوران طواف ہوئی مگر گفتگو مجلس میں ہوئی۔

۵۳ھ ابن ہشام، اول ص۳۸۸ نیز تفاسیر قرآن۔

۵۴ھ ابن ہشام اول ص۹-۴۱۸۔ بعض روایات کے مطابق مسلمان ہونے والے نصاریٰ حبشہ کے نہیں نجران کے تھے۔ ابن اسحاق اور ان کے مدیر نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ لیکن انھوں نے اول الذکر کو ترجیح دی ہے۔

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی کی نئی پیشکش

عہد نبوی کا نظام حکومت

پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی

سیرت نبوی اور اس کے مختلف پہلوؤں پر اب تک چھوٹی بڑی بے شمار کتابیں لکھی جاچکی ہیں اور یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا۔ لیکن اس کتاب میں اس لحاظ سے جدت اور ندرت پائی جاتی ہے کہ وہ ایسے موضوعات پر مشتمل ہے جن سے کتب سیرت میں بہت کم تعرض کیا گیا ہے۔ ابتداء میں عہد رسالت میں ریاست کے تدریجی ارتقاء پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے پھر اس کے دور مبارک میں شہری نظم ونسق اور فوجی، مالی اور مذہبی نظاموں سے مفصل بحث کی ہے۔

اسلامی تاریخ اور سیرت نبوی پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی کا خاص موضوع ہے۔ ان کا نام اعلیٰ تحقیقی معیار کی ضمانت ہے۔

کتاب پر مولانا سید جلال الدین عمری سکریٹری ادارہ اور نائب امیر جماعت اسلامی ہند کا مختصر اور مفید مقدمہ بھی ہے۔

آفسٹ کی خوبصورت طباعت، عمدہ کاغذ صفحات ۱۳۶ قیمت ۳۰/- زیادہ منگوانے پر خصوصی رعایت

مکتبہ تحقیق وتصنیف اسلامی۔ پان والی کوٹھی۔ دودھ پور علی گڑھ

بحث ونظر

فلسفۂ نظمِ قرآن
متوازن نقطۂ نظر

مولانا سلطان احمد اصلاحی

قرآنی علوم و معارف کے مسائل میں ایک اہم مسئلے قرآن کے نظم اور اس کی ترتیب کے سلسلے میں اب تک کی علماء کی جماعت کو تین طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک طبقہ وہ ہے جو کتاب اللہ میں سرے سے کسی قسم کے نظم و ترتیب کا انکار کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ قرآن تیئس سال کے طویل عرصے میں حالات کے لحاظ سے تھوڑا تھوڑا کرکے وقفہ وقفہ سے اترتا رہا۔ بعد میں انہی متفرق آیات کو ایک ترتیب سے جمع کر دیا گیا۔ پس اس طرح کے کسی کلام میں نظم و ارتباط کی تلاش ایک سعی بے سود ہے[1] دوسرا طبقہ وہ ہے جو کتاب اللہ میں سخت گیر نظم کا تو قائل نہیں جیسا کہ آگے آنے والا تیسرا طبقہ ہے، تاہم وہ فی الجملہ کتاب الٰہی میں نظم و ترتیب کا قائل ہے، اور قرآن کی تفسیر میں جا بجا وہ اپنی بساط کی حد تک اس نظم کو اجاگر کرنے اور اسے نبھانے کی کوشش کرتا ہے[2] تیسرے طبقے میں مفسّرین کی وہ قلیل جماعت ہے جو پورے التزام اور سختی سے نہ صرف یہ کہ ایک سورہ کی تمام آیات کو ایک دوسرے سے مربوط مانتا ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ایک سورہ کا دوسری سورہ سے نظم قائم کرتا ہے اور اس طرح اول تا آخر کتاب اللہ کو ایک مکمل مربوط و منظم کتاب کی صورت میں پیش کرتا ہے جس سے اعلیٰ اور برتر نظم و ارتباط کسی انسانی اور غیر انسانی تصنیف میں نہیں کیا جا سکتا[3] اسی تیسرے طبقے سے ہمارے دور آخر کے اہم مفسر قرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کا تعلق ہے جنھوں نے بعض پہلوؤں سے اس کے سلسلے میں وہ گہرائی اور نیا پن سامنے لانے کی کوشش کی ہے جس کی نظیر اس کے قائل دوسرے علماء و مفسرین کے یہاں بھی نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ تفسیر میں ان کی شناخت ہی فلسفۂ نظم قرآن کے داعی اور مبلغ کی حیثیت سے قائم ہو گئی ہے، جس کا بجا طور پر ان کو حق پہنچتا ہے۔ کتاب اللہ پر

اس پہلو سے جس یکسوئی اور انہماک سے فکر و تدبر کا انھوں نے حق ادا کیا ہے، علمائے امت میں کم ہی لوگوں کے حصے میں یہ سعادت اس وافر مقدار میں شائد ہی آسکے۔ قرآنیات پر ان کی تمام تر کتابوں کا یہی مرکزی نکتہ ہے اور یہی محور ہے جس کے گرد ان کی فکری مسائی کا پورا کارواں گردش کرتا ہے [۵۹] ذیل کی سطور میں کتاب اللہ میں نظم و ترتیب کی نسبت سے ان تینوں آراء کے مدنظر نقطۂ اعتدال و توازن کی تلاش مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس نازک موضوع پر وہ بات کہنے کی توفیق عطا فرمائیں جو ان کو پسند ہو اور جو ان کی نازل کردہ کتاب عظیم وحکیم کے شایانِ شان ہو۔ وما توفیقی الا باللہ۔

نظم قرآن اصلاً توقیفی ہے

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات جو سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ نظم قرآن اصلاً توقیفی ہے۔ کتاب اللہ میں بوجوہ نظم و ترتیب کو ناگزیر ماننے کے باوجود جس کی تفصیل آگے آتی ہے، اصلاً یہ ترتیب توقیفی اور تعبدی ہے۔ جس طرح عبادات و معاملات میں اعداد و مقادیر کا معاملہ اصلاً توقیفی اور تعبدی ہے، کتاب اللہ میں نظم و ترتیب کے معاملے کو اس سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ نماز کے اوقات، اس کی رکعتوں کی تعداد، روزہ کا وقت اور اس کے لیے ایک مخصوص مہینے کی تعیین، زکوٰۃ کا نصاب اور اس کے وجوب کے لیے حولان حول کی شرط، حج کے مخصوص ایام اور مراسم کا مخصوص انداز، چوری میں کہنیوں سے ہاتھ کا کاٹا جانا، غیر محصن زانی کے لیے سو کوڑے کی سزا، قصاص میں دیت کی مخصوص مقدار وغیرہ وغیرہ بے شمار معاملات و مسائل میں اعداد و مقادیر کا معاملہ اصلاً توقیفی اور تعبدی ہے، جس کی حکمتوں اور مصلحتوں پر علماء نے ہر دور میں بحث کی ہے اور آج تک اس کا سلسلہ جاری ہے [۶۰] لیکن یہ محض سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش ہے اور جیسا کہ کہا گیا ہے اس طرح کی بحثوں کا اصل تخاطب کمزور ایمان کے لوگوں سے ہے، ورنہ سچے مسلمان کا مسلک بے چون وچرا اللہ کے ہر حکم اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر فرمان پر ایمان اور اس پر مخلصانہ عمل ہے [۶۱]۔ نظم قرآن کے سلسلے میں بھی صحیح بات یہی ہے کہ اپنی بساط کے مطابق اسے جس قدر بھی سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جائے، فی الحقیقت اس کا معاملہ اس کتاب کے نازل کرنے والے کی طرف راجع ہے۔ دین کے دیگر اعداد و مقادیر کے ساتھ اپنی کتاب کے نظم و ترتیب کی

حکمت و مصلحت کو بھی دراصل وہی جان سکتے ہیں۔ اللہ کی آخری کتاب کبھی ختم نہ ہونے والے علوم و معارف کا لازوال خزانہ ہے اور اس میں واجب فکر و تدبر کا ایک حصہ اس کے نظم و ترتیب کا بھی ہوسکتا ہے، جیسا کہ علماء کی ایک جماعت کے یہاں اس کا احترام اور التزام ہے، لیکن آخری بات یہی ہے کہ یہ بندے کی ادنیٰ اور حقیر سمجھ ہے، اصل حقیقت کا علم اس کے نازل کرنے والے کو ہی ہوسکتا ہے۔ سمجھ میں آئے نہ آئے کتاب اللہ کی ترتیب برحق ہے، انتشار اور خلل سے بالکل پاک علوم و معارف کا گنجینہ ہونے کے ساتھ یہ نظم و ترتیب کا شاہکار ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی بندے کو اس سے کس قدر حصہ ملتا ہے اور عبادات و معاملات کے دیگر اعداد و مقادیر کی حکمتوں اور مصلحتوں کی دریافت کے ساتھ وہ کتاب اللہ کے نظم و ترتیب کو بھی کسی قدر ڈھونڈھنے اور نکالنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

نظمِ قرآن ترتیب آیات وسور کا لازمی تقاضا

جیسا کہ اشارہ گزرا، کتاب الٰہی میں آیتوں اور سورتوں کی ایک خاص ترتیب اس کے اندر کسی نہ کسی نوع کے لازمی نظم و ارتباط کا تقاضا کرتی ہے۔ اس سلسلے میں جہاں تک ایک سورہ کی آیتوں کی ترتیب کا سوال ہے تو اس کے توقیفی اور من جانب اللہ ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، اس لیے سرتاپا علم و حکمت ذات خداوندی کی اس ترتیب میں تو نظم و ارتباط کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں، یہ الگ ہے کہ وہ ہماری سمجھ میں کس قدر آتا ہے یا آتا بھی ہے یا نہیں۔ سورتوں کی ترتیب کے سلسلے میں بھی صحیح بات یہی ہے کہ آیتوں کی ترتیب کی طرح ان کی ترتیب بھی توقیفی اور من جانب اللہ ہے۔ امت میں جن بزرگوں نے سورتوں کی ترتیب کو حضرات صحابہ کرامؓ کے اجتہاد پر محول مانا ہے ان کی رائے صحیح نہیں ہے[۵] جس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ جن کی بہت بڑی اکثریت کو قرآن شریف از اول تا آخر حفظ تھا، اگر صرف کتاب اللہ کی آیتوں کی ترتیب ہی توقیفی ہوتی، سورتوں کی ترتیب توقیفی نہ ہوتی، تو کتاب اللہ کی تلاوت، نوافل میں اس کی قرأت اور اس کے ورد و مذاکرے کی مجلسوں میں بار بار اس میں اختلاف اور مصحف سے مختلف ترتیب کا جا بجا تذکرہ ہوتا جبکہ حدیث و سیرت اور تاریخ کے پورے ذخیرے میں اس کی ایک بھی نظیر نہیں ملتی۔ اس کے برعکس

ہفتے میں مختلف و متعدد حضرات صحابہؓ کے ختم قرآن کا جو کورس (حزب) تھا اس میں مصحف کی موجودہ ترتیب کے مطابق ہر روز سورتوں کی ایک خاص تعداد کی تلاوت کی صراحت ہے۔ یہ اپنے آپ میں اس کا ثبوت ہے کہ نہ صرف ایک سورہ کی آیات بلکہ از اول تا آخر سورتوں کی ترتیب بھی اس طرح من جانب اللہ متعین کردہ صدر اول میں معلوم و متعارف تھی۔ جس کے سلسلے میں کسی اختلاف اور دوسرے خیال کا دور دور تک کہیں سراغ نہیں مزید براں معلوم ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وصال سے قبل ہر رمضان میں کتاب اللہ کا حضرت جبریلؑ کے روبرو دورہ کرتے تھے، جس سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا اس سے متصل رمضان میں یہ دورہ معمول سے ہٹ کر دو بار ہوا۔ ایک بار جبریل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا قرآن سنایا، دوسری بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے اس کا دورہ کیا۔ آیتوں کے برعکس اگر کتاب اللہ کی سورتوں کی ترتیب توقیفی نہ ہوتی تو کسی نہ کسی مرحلے میں اس دوہرے دورے میں ترتیب کا اختلاف ضرور سامنے آتا جبکہ حدیث و سیرت کے پورے ذخیرے میں دور دور تک اس کا کوئی سراغ نہیں۔ مزید یہ کہ جب دوسرے اور تیسرے نمبر پر حدیث اور فقہ کی کتابوں میں ایک کتاب کے بعد دوسری کتاب اور ایک باب کے بعد دوسرے باب کی ترتیب کی مناسبت اور ان کے باہمی ربط و ارتباط کے التزام کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اور بے شک و شبہ اسے پسندیدگی اور تحسین کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، تو صرف کتاب اللہ کے ساتھ ہی یہ امتیازی برتاؤ کیوں کہ اس کے اندر کسی قسم کے نظم و ترتیب کے نہ ہونے کو ہی اس کا مایہ الافتخار سمجھا جائے اور اسے اس کی عظمت اور بلندی کی دلیل باور کرایا جائے۔ عام انسانی کتاب میں بھی لمبے عرصے میں لکھے گئے اس کے متفرق مضامین کو کتابی شکل میں لاتے وقت اپنے بس بھر اسے حسن ترتیب کا نمونہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، تو خدائے عظیم و برتر کی کتاب رفیع تو بدرجہ اولیٰ اس کی مستحق ہے کہ اسے نظم و ترتیب سے عاری نہ قرار دیا جائے اور عام انسانی تصنیف کی نسبت سے جو چیز اس کا نقص قرار پائے کتاب اللہ کے سلسلے میں اسے اس کا کمال باور کرایا جائے۔

نظمِ قرآن کا ایک نیا پہلو

اس اصولی بات کو تسلیم کر لینے کے بعد کہ کتاب اللہ میں کسی نہ کسی نوع کا نظم و ترتیب

ضرور موجود ہے، آگے اس کی تعیین اور اس میں غور و تدبر کی جولان گاہ بہت وسیع ہے۔ اس سلسلے میں جہاں تک ایک سورہ کی آیتوں میں نظم و ترتیب کا سوال ہے اس کی یاد دہانی اور اس کی طرف توجہ کا اہتمام تو کسی نہ کسی درجے میں مفسرین کی اکثریت کے یہاں ہے۔ ایک سورہ کے دوسرے سورہ سے ربط و تعلق کے سلسلے میں بھی مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں اور بہت سی باتیں کہی گئی ہیں[۱]۔ اسی طرح کی ایک بات کتاب اللہ کے اس ادنیٰ طالب علم کی سمجھ میں آتی ہے۔ پورا قرآن سورۂ فاتحہ میں بندے کی دعا کا جواب ہے، یہ بات بہت لوگوں نے کہی ہے، یہ خود ایک طرح سے پورے قرآن کے نظم کا بیان ہے۔ اس کے علاوہ معلوم ہے کہ کتاب اللہ میں شروع سے آخر تک مکی اور مدنی سورتوں کا خاص امتزاج ہے، جس کے سلسلے میں بھی دوسری باتیں کہی گئی ہیں[۱۱]۔ ایک اور بات بھی سمجھ میں آتی ہے۔ کتاب اللہ اصلاً کتاب دعوت ہے اور اس سے تذکیر اور اعتبار اس کا اصل مقصود ہے۔ اس کے لحاظ سے مکی اور مدنی سورتوں کی خاص ترتیب کا دوسرا پیغام بھی ہو سکتا ہے۔ اس امت کے لیے وسیع دائرے میں دین پر عمل کے مدنی زندگی کے حالات اس کی سورتوں کے مصداق اسی صورت میں پیدا ہو سکتے ہیں جبکہ اس سے پہلے مکی سورتوں کے مصداق مکی زندگی کے تقاضوں سے کامیاب عہدہ برآری کا وہ ثبوت پیش کر دے۔ نیز یہ کہ وسیع تر دائرہ زندگی سے متعلق مدنی سورتوں کی تعلیمات پر عمل کے لیے ضروری ہے کہ مکی سورتوں میں ایمانیات و عقائد میں مضبوطی اور پختگی کی جو تعلیم ہے، اسے اپنے اندر اتارا اور جذب کیا جائے۔ مکی سورہ فاتحہ کے بعد بقرہ، آل عمران، نسا، اور مائدہ کی مدنی سورتوں کا جو سلسلہ ہے، اس کے بعد دو مکی انعام و اعراف کے بعد انفال و توبہ مدنی، بعد ازاں طویل مکی سلسلوں کے درمیان حج و نور، آگے اسی طرح احزاب، محمدؐ و فتح اور حجرات، آگے اسی طرح مکی کے بعد حدید کے ساتھ پورا اٹھائیسواں پارہ مدنی، باقی آخری دونوں پاروں میں تمام مکی سورتوں میں بینہ، زلزال، کوثر، نصر اور معوذتین مدنی۔ یہ تمام مدنی سورتیں دراصل بقرہ تا مائدہ کے مدنی سلسلے کا تکملہ و تتمہ ہیں، جس طرح کہ انعام و اعراف کے بعد کا آخر قرآن تک کا پورا مکی سلسلہ ان دونوں سورتوں کا حصہ اور ضمیمہ ہے۔ ان مکی اور مدنی سلسلوں کو عام تقسیم کے لحاظ سے یکجا نہ رکھ کر انھیں مکی اور مدنی کے امتزاج سے آگے بڑھانے کی ایک حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے جو اوپر بیان ہوئی کہ قیامت تک کے لیے مکی اور مدنی حالات سے دوچار الگ

خطوں اور الگ الگ علاقوں اور ملکوں سے وابستہ امت کے لیے ان میں یہ پیغام رہے کہ وہ پہلے مکی زندگی کے تقاضوں سے عہدہ برآہوں جب انھیں مدنی زندگی کے حالات سے واسطہ ہوگا، نیز یہ کہ مدنی سورتوں کو سنبھالنے اور ان سے کامیاب عہدہ برآہونے کے لیے مکی سورتوں کے عقائد وایمانیات کو اپنے اندر پختہ سے پختہ تر کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ایک طالبعلمانہ عرض ہے ورنہ ہر صاحب توفیق اپنی حیثیت سے اس کی حکمتوں اور مصلحتوں کو تلاش کرسکتا اور اسے دنیا کے سامنے پیش کرنے کا حق رکھتا ہے۔

غلو سے پرہیز

لیکن اس کے ساتھ ہی نظم قرآن اور اس کی ترتیب ومناسبت کے مسئلے میں غلو سے پرہیز کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآن میں نظم ضروری ہے اور اللہ کی کتاب اگر حسن ترتیب کا شاہکار نہ ہو تو اور کسے اس کا حق پہنچتا ہے۔ لیکن، جیسا کہ گزرا، اصلاً یہ نظم وترتیب توقیفی اور تعبدی ہو کر اس کی تلاش اور جستجو کو ایک دائرے کے اندر محدود رکھنا ہی مناسب ہے۔ اس پس منظر میں ہند میں تفسیر کے ایک خاص مکتب فکر کی طرف سے جو نظم قرآن کو دین وایمان کا اصل مسئلہ اور اس کی طرف عدم توجہ کو امت کی تمام خرابیوں کی جڑ اور اس کے تمام تر افتراق وانتشار کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے[۱۳] یہ مبالغہ آمیز ہے۔ قرآن نے جو اس امت کو خیر امت[۱۴] کہا ہے تو اس میں یہ بات شامل ہے کہ قیامت تک کے لیے اس امت کی یہ 'خیریت' اسی طرح باقی رہے گی یہی بات ہے جو حدیث میں اس طرح کہی گئی ہے کہ قیامت تک یہ امت دین کے صحیح راستے پر قائم رہے گی[۱۵] نیز یہ کہ یہ امت کبھی بھی گمراہی پر اکٹھا نہ ہوگی[۱۶] جو اصول فقہ میں حجیت اجماع کی بنیاد ہے[۱۷]۔ مزید براں ایک حدیث میں اس امت کو 'شہداء اللہ فی الارض' کے خطاب سے نوازا گیا ہے جس کی تفصیل میں یہ مضمون ہے کہ اس کی گواہی سے ایک شخص کے لیے جنت یا جہنم کا فیصلہ ہوسکتا ہے[۱۸] جس امت کا قرآن وسنت میں یہ مقام ہو اسے محض نظم قرآن میں غفلت سے یہود ونصاریٰ کی روش پر عمل پیرا اور ان کے گناہوں کی مجرم نہیں گردانا جاسکتا، جیسا کہ نظم قرآن کے مؤید مخصوص حلقے کی طرف سے اسے اسی جرم کا مرتکب قرار دیا گیا ہے[۱۹]۔ قرآن وسنت کی تعبیر اور دین کے کسی حصے کی ترجمانی کی اصل خوبی یہ ہے کہ اس

کے ہر مرحلہ میں اعتدال و توازن سے رشتہ استوار رہے اور تعبیر کے کسی جزء میں مبالغہ آرائی اور غلو اور تشدد کو در آنے کا موقع نہ ملے۔

نظم قرآن تفسیر کی امکانی غلطی سے حفاظت کی ضمانت نہیں

نظم قرآن کے موید اس مخصوص حلقے کی طرف سے یہ بات بہت ابھار کر کہی گئی ہے کہ نظم قرآن فہم قرآن کی کلید ہے اور اس کی بدولت تفسیر قرآن کی امکانی غلطی سے حفاظت کی ضمانت مل جاتی ہے۔ سورہ کے عمود اور نظم اور آیت کے سیاق و سباق سے ہر آیت کی ایک متعین تفسیر نکھر کر سامنے آجاتی ہے اور آدمی اِدھر اُدھر کی تاویلات کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ نظم قرآن کی فہم قرآن کی نسبت سے کیا اہمیت اور اس کا کیا درجہ ہے اس پر گفتگو ہم آگے کریں گے، اس کی بدولت تفسیر قرآن کی امکانی غلطی سے حفاظت کی ضمانت کی بات بھی جس زور شور سے کہی گئی ہے حقائق اس کی تائید کرنے سے قاصر ہیں۔ اسی کی اساس پر اس کے سب سے بڑے وکیل مولانا فراہیؒ نے سورہ فیل کی بالکل طبع زاد تفسیر پیش کی[۲۰] جس کی تردید کے لیے کتاب اللہ میں 'ارسلنا علیٰ' کے مواقع استعمالات پر ایک نظر ڈال لینا ہی کافی ہے۔ ایک 'ارسلنا الیٰ' ہے جس کا استعمال قرآن میں رسولوں اور فرشتوں وغیرہ کے بھیجنے کے عام معنی میں ہے[۲۱] دوسرا 'ارسلنا علیٰ' ہے جس کا استعمال بلا استثناء کتاب اللہ میں مختلف چیزوں کو سرکش اقوام و جماعات پر عذاب الٰہی کے طور پر بھیجنے کے لیے ہے۔ فرعون کا حکمراں خانوادہ جب خشک سالیوں اور غلے اور پھلوں کی خدائی تنبیہات سے حضرت موسیٰؑ کی مخالفت سے باز نہیں آیا تو ان کی بد دعا سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے اوپر دوسرے عذابوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دریائے نیل کی طغیانی اس درجہ بڑھی کہ کھیت باغ اور گھروں کا بڑے پیمانے پر نقصان ہوا۔ باقی جو کسر رہی اسے ٹڈی دلوں نے پورا کیا جو ان کے پھلوں اور سبزی کی کھیتیوں کو صاف کر گئیں۔ مزید جوئیں رہیں جو ان کے بدن اور کپڑوں میں پڑ کر ان کے لیے عذاب بن گئیں۔ آگے مینڈک کی بلا تھی جو ان کے گھروں میں بھر گئی اور ان کے کھانوں میں ڈبڈبانے لگی۔ آخری آفت یہ کہ پانی خون میں تبدیل ہو جاتا جس سے زندگی اجیرن ہو گئی[۲۲] اس آفت اور عذاب کے لیے کتاب اللہ نے 'ارسلنا علیٰ' کے الفاظ استعمال کیے۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝ (اعراف : ۱۳۳)	تو ہم نے ان کے اوپر دریائی طوفان، ٹڈیاں، جوئیں، مینڈکوں اور خون کو مسلط کردیا، یہ بہت ہی کھلی اور ابھری ہوئی نشانیاں تھیں، اس کے باوجود وہ اپنے غرور کی روش پر اڑے رہے، واقعی یہ بڑے مجرم لوگ تھے۔

آگے قرآن نے صاف لفظوں میں اس کے لیے عذاب 'رجز' کا لفظ استعمال کیا[۲۴] اور فرعون کو غرق دریا کیے جانے کے اپنے آخری عذاب کو اسی سلسلے کی اگلی کڑی قرار دیا:

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ۝ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ۝ (اعراف : ۱۳۶)	تو جب ان پر یہ عذاب آپڑا تو وہ عرض گزار ہوئے کہ اے موسیٰ تم اپنے رب سے اس چیز کے لیے دعا کرو جس کا اس نے تم سے وعدہ کر رکھا ہے۔ اگر تم یہ عذاب ہم سے ہٹا دو تو ہم لازمی تم پر ایمان لائیں اور تمہارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دیں۔ تو جب ہم نے ان سے اس عذاب کو مختصر مدت کے لیے ہٹا دیا جس تک پہنچنے میں انھیں بہت دیر نہیں ہوسکتی تھی تو پھر وہ بہت جلد اپنی پرانی بدعہدی پر اتر آئے۔ تو اب ہم نے ان سے بدلہ لیا اور انھیں سمندر میں غرق کردیا۔ اس لیے کہ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے غفلت کی روش پر ڈٹے رہنے پر مطمئن رہے۔

اس سے زیادہ واضح معاملہ سورہ قمر میں 'علیٰ' کے ساتھ 'ارسال' کے استعمال کا ہے۔ جہاں بہ ترتیب قوم عاد، ثمود اور قوم لوط کے لیے زبردست آواز کے ساتھ طوفانی ہوا، چنگھاڑ اور پتھروں کی بوچھاڑ کرنے والی ہوا کے عذاب کے بیان میں

اسی ترکیب کا استعمال کیا گیا:

إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي يَوْمِ نَحْسٍ مُسْتَمِرٍّ (۱۹) [۲۳]	ہم نے ان کے اوپر تیز و تند ہوا کو مسلط کر دیا ایک نحوست کے دن میں جس کا سلسلہ آگے تک دراز رہا۔
إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَاحِدَةً فَكَانُوا كَهَشِيمِ الْمُحْتَظِرِ (۳۱)	ہم نے ان کے اوپر ایک ہی چنگھاڑ مسلط کی جس کے بعد وہ روندی ہوئی باڑھ کے مانند چورا ہو کر رہ گئے۔
إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا إِلَّا آلَ لُوطٍ نَجَّيْنَاهُمْ بِسَحَرٍ (۳۴)	ہم نے ان کے اوپر کنکریلی ہوا مسلط کر دی، صرف لوط کے خاندان اور اس کے پیروکار اس سے الگ رہے جنھیں رات اندھیرے ہی ہم نے بچا کر نکال دیا۔

نظم قرآن کی اسی ضمانت کے باوجود رجم محصن کی امت کی اجماعی رائے کا انکار کیا گیا اور زانی کی سزا کے سلسلے میں بالکل بے اصل شگوفہ چھوڑا گیا اور استاد کی غلطی کو شاگرد نے پورے شرح صدر کے ساتھ دوہرایا[۲۶] اور مقطع کے طور پر اس کی وہ وکالت سامنے آئی جسے انصاف کی زبان میں 'ظلمات بعضها فوق بعض' کے سوا دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔[۲۷] اور نظم کی اسی کلید کو ہاتھ میں رکھنے کے باوجود مکتب فراہی کے سب سے بڑے ترجمان نے سورہ فتح کی آیت کریمہ:

لِتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا (۹)	تاکہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، رسول کی مدد کرو، اللہ کی عزت کرو اور صبح و شام اس کی پاکی کے بیان کا اہتمام رکھو۔

کے ٹکڑے 'توقروہ' میں وقار کے استعمال کو ذات باری تعالیٰ کے لیے ناموزوں اور کتاب اللہ کے مواقع استعمال سے ہٹا ہوا قرار دیا[۲۸] جبکہ سورۂ نوح میں اللہ تعالیٰ کے نام کی صراحت سے ان کے لیے اس لفظ کو استعمال کیا گیا:

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ	تمہیں کیا ہو گیا ہے جو تم اللہ کی عزت

وَقَارًا ٥ وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا ٥ (۱۳-۱۴) — نہیں کرتے جبکہ وہی ہے جس نے تمہیں کئی کئی مرحلوں سے گزار کر تمہاری تخلیق کو مکمل کیا۔

عام طور پر اس مکتب فکر کی طرف سے بے وقعت و بے مایہ قرار دی جانے والی تفسیر کی متداول کتابوں میں ایسی فاحش غلطی کی نظیر ابھی تک ان سطور کے لکھنے والے کی نظروں سے نہیں گزری۔

صلب العلم نہیں ملح العلم

اس تفصیل کی روشنی میں فلسفۂ نظم قرآن کو اس کی مناسب اہمیت کے اعتراف کے ساتھ صلب العلم کے بجائے ملح العلم کے خانے میں رکھے بغیر چارہ نہیں۔ معلوم ہے کہ علمائے اصول نے اپنی اہمیت اور اقدمیت کے اعتبار سے اسلامی علوم کی درجہ بندی کی ہے۔ اس کے ایک حصے کو انھوں نے اصلی اور حقیقی علم قرار دیا ہے تو دوسرے کو نکتہ آفرینی اور لطائف کے ذیل میں رکھا ہے۔ پہلے کو جسے صلب العلم کہا گیا ہے اس میں عام ضرورت کا شریعت کا علم ہے جس کی لازمی عملی ضرورت ہو، دوسرا 'ملح العلم' ہے جس کی عملی افادیت کو وہ اہمیت حاصل نہ ہو جیسے کہ نماز روزے وغیرہ کے تعبدی پہلوؤں کی حکمت کی تلاش۔ یہاں تک کہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی اگر ایک صحیح سند فراہم ہو جائے تو اس کے بعد مضمون کے اضافہ کے بغیر محض اسناد کے تنوع اور اس کی کثرت کو بھی بجائے 'صلب العلم' کے 'ملح العلم' کے دائرے میں رکھا گیا ہے[۲۹] جس کی روشنی میں آج کے دینیات و اسلامیات کے بہت سارے کاموں کو جو تحصیل حاصل کے درجے میں ہوں انھیں 'صلب العلم' کے بجائے 'ملح العلم' کا ہی نام دینا مناسب ہوگا۔ اسی طرح ان کے مطلوب اور محمود کاموں کے حوالے برائے حوالے کے کافی بڑے حصے کو بھی اسی 'ملح العلم' میں شامل کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑے گا۔ اس روشنی میں دیکھا جائے تو انسانی تصنیفات کے انداز پر از اول تا آخر سخت گیر نظم قرآن کے فلسفہ کو بھی بجائے صلب العلم کے ملح العلم کے زمرے میں لانے سے مفر نہیں۔

کتاب اللہ کی احکامی آیات ہوں یا آیات اعتبار و حکمت ہر ایک میں بنائے حکم اور بنائے استدلال آیات کا کوئی جھرمٹ یا ان کا کوئی مجموعہ نہیں بلکہ انفرادی آیات ہیں۔

عالمی اہمیت کے لٹریچر کی عظمت کا راز بھی ان کے سخت گیر نظم اور ترتیب کے بجائے ان کے منفرد ٹکڑوں اور جداگانہ حصوں سے وابستہ ہے۔ مثنوی مولانا روم کی عظمت اس کے نظم و ترتیب سے زیادہ اس کے انفرادی اشعار اور الگ الگ حکایتوں سے وابستہ ہے۔ نہ یہ کہ ایک شعر کے بعد دوسرا شعر کیوں ہے یا یہ کہ ایک حکایت کے بعد دوسری آیت کیوں آئی ہے یہی بات حافظ اور غالب کی شاعری، مجدد الف ثانی کے مکتوبات اور حضرت شرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات صدی کے سلسلے میں صادق آتی ہے۔ تورات اور انجیل کی بھی آج جو اہمیت ہے یا ہوسکتی ہے وہ بھی ان کی انفرادی آیات اور انفرادی تعلیمات اور متعین مجموعۂ واقعات سے ہے۔ مقدس تورات کی بڑائی اس سے نہیں کہ خروج کے بعد احبار اور گنتی کے بعد استثناء کیوں آیا۔ یا یہ کہ انجیل میں متی کی انجیل کے بعد مرقس کی انجیل اور لوقا کی انجیل کے بعد یوحنا کی انجیل کیوں آئی ہے۔ زمخشری بھی جو قرآن کے اعجاز کو اس کے نظم میں مضمر مانتے ہیں[۵۱] تو اس کا مطلب بھی ان کے نزدیک ایک آیت کریمہ کے اندرونی دروبست سے ہی ہے جس کے کسی ایک نگینے کے ہٹ جانے سے پورا تاج خلل کا شکار نظر آنے لگتا ہے۔ جس سے شبہ ہوتا ہے کہ سلف میں جن دوسرے لوگوں نے نظم قرآن کے عنوان سے کتابیں لکھیں[۵۲] ان کا منشا فراہی مکتب فکر کے نظم قرآن سے ہٹ کر منفرد آیات کا یہی دروبست تو نہیں جس کی عظمت بے غبار اور جس کے روبرو انسان اپنی عجز و بے مائگی کے اعتراف کے لیے اپنے کو مجبور پاتا ہے۔

قرآن کا ذووجوہ ہونا 'لاینقضی عجائبہٗ' کا لازمی تقاضا

کہنے کو یہ بات بہت اچھی لگتی ہے کہ سخت گیر نظم قرآن ہی فہم قرآن کی کلید ہے۔ کلام عرب کی روشنی میں الفاظ کی تحقیق، سورہ کے مرکزی مضمون 'عمود' اور آیت کے سیاق و سباق سے ہر آیت کریمہ اور اس کے ہر حصے کا ایک متعین مفہوم نکھر کر سامنے آگیا اور کتاب اللہ کے سلسلے میں مختلف و متنوع تاویلات کا دروازہ بند ہوگیا جس سے ذہنی انتشار اور قلبی تشتت کی کیفیت سے نکل کر طالب قرآن شرح صدر کی دولت سے مالامال ہوگیا۔ لیکن گہرائی سے دیکھا جائے تو کتاب اللہ کی مدح سے

زیادہ اس میں اس کی قدح کا پہلو ہے۔ ہر مسلمان کا یہ ایمان ہے اور قرآن کے ہر مفسر کے یہاں اس کا اعتراف ہے کہ کتاب اللہ علوم و معارف کا بحر ناپیدا کنار ہے جس کی تہ تک پہنچنا تو درکنار اس کی سطح کو چھونے کا دعویٰ کرنا بھی اپنی محدود عقل و فہم اور محدود صلاحیتوں کے ساتھ انسان کے لیے اپنے اوپر سب سے بڑا ظلم ہے۔ جس کے سلسلے میں عام طور پر عظمت قرآن کے سلسلے میں حضرت علیؓ کی طویل مشہور روایت کے مذکورہ ٹکڑے 'لا ینقضی عجائبہ' کا حوالہ دیا جاتا ہے[۳۱] یہ روایت مجہول اور اس کے ایک راوی پر کلام ہے[۳۲] محض اس کی شہرت کی بنا پر ہم نے سب سے پہلے اس کا حوالہ دیا لیکن اس کے مضمون میں کوئی کلام نہیں اور دوسرے صحیح طریقوں سے یہ بالکل ثابت ہے۔ قرآن کی عظمت کے سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری صحیح حدیث جس میں لہجوں کے اختلاف کی گنجائش کے ساتھ قرآن کے ایک ظاہری اور ایک باطنی مفہوم کا تذکرہ ہے۔ انزل القرآن علی سبعۃ احرف لکل آیۃ منہا ظہر و بطن۔ (قرآن سات حرفوں پر اترا ہے، اس کی ہر آیت کا ایک ظاہری اور اس کا ایک باطنی مفہوم ہے) اس سے آگے کا ٹکڑا ہے:

ولکل حد مطلع — ہر پڑاؤ اپنے سامنے نئی منزل کا نشان رکھتا ہے۔

اس کا یہی مطلب ہے کہ کتاب اللہ کے ایک ایک ٹکڑے اور اس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف کے سلسلے میں غور کرنے والا جسے اپنے فکر و تدبر کی آخری منزل سمجھتا ہے حقیقت کے اعتبار سے وہ اس کی پہلی منزل ہوتی ہے۔ جس پڑاؤ کو وہ اپنی آخری ٹھکان سمجھ کر اس پر ٹھہرنا چاہتا ہے، جھانک کر دیکھتا ہے تو اس کے عین سامنے اسے دوسرا پڑاؤ نظر آتا ہے یہاں تک کہ یہ سفر انتہا، کے بغیر اسی طرح جاری رہتا ہے۔ لیکن اس سے بڑھ کر یہ مضمون کتاب اللہ کی آیت ذیل سے ثابت ہوتا ہے۔

قل لو کان البحر مدادا	کہئے کہ اگر میرے رب کی باتوں کے
لکلمت ربی لنفد البحر	بیان کے لیے سمندر بھی روشنائی میں
قبل أن تنفد کلمت ربی	تبدیل ہوجائے تو یہ روشنائی بھی ختم
ولو جئنا بمثلہ مددا ۝	ہوجائے لیکن میرے رب کی باتیں ختم
(کہف: ۱۰۹)[۳۳]	ہونے کا نام نہ لیں۔ چاہے اس کے برابر
	ہی ہم دوسری روشنائی کا انتظام کیوں نہ کریں۔

اب اگر سخت گیر نظام قرآن کی بدولت ہر لفظ کے ایک ہی معنی اور ہر آیت کی ایک ہی تاویل کی گنجائش رہے تو اس کا صاف مطلب ہوا کہ اس مطلوب تفسیر کے بعد کتاب اللہ کے عجائبات ختم ہو گئے، قرآن کا مسافر اپنے پڑاؤ کی آخری منزل پر آگیا اور رب کی باتیں ایک خاص تفسیر کے دائرے میں محدود ہو کر رہ گئیں۔ یہ کتاب اللہ کی مدح نہیں اس کی قدح ہے۔ انسانی تصنیفات میں بھی جنھیں امہات کتب کہا جاتا ہے ان کی اصل خوبی یہی ہے کہ ان کا مواد ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ طالب علمی کے دور سے لے کر عمر کے آخری ایام تک آدمی ان سے چمٹا رہتا ہے، لیکن ان سے ہر نئی مراجعت اپنے ساتھ نئے نکات اور نئے مضامین برآمد کرتی ہے۔ حق یہ ہے کہ معانی کی اس وسعت میں کتاب اللہ کا جواب نہیں۔ چودہ سو سال کے عرصے میں قرآنی علوم و معارف کے دفتر کے دفتر بھر گئے اور لائبریریوں کی لائبریریاں تیار ہو گئیں لیکن ہنوز تدبر قرآن کا قافلہ اپنی ابتدائی منزل کو بھی پا لینے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ استادانِ فن کی کسی غزل کے ایک شعر کی کسی تشریح کو اس کی آخری اور حتمی تشریح قرار نہیں دیا جا سکتا تو کتاب اللہ کا مقام تو اس سے بہت بلند ہے کہ انسانی ذہن اس کی وسعتوں کو قید کرنے کا دعویٰ کر سکے۔

متنوع تفسیر قرآن عظمتِ قرآن کی مظہر

حقیقت یہ ہے کہ متنوع تفسیر قرآن عظمت قرآن کی مظہر ہے، یہ اس کا عیب نہیں بلکہ اس کے حقیقی حسن کی آئینہ دار ہے۔ قرآن حقیقۃً تذکیر اور یاد دہانی کی کتاب ہے اور اس کی اصل حیثیت انسانی مسائل کے لیے شاہ کلید کی ہے۔ اس لحاظ سے اس پر اصل فکر و تدبر یہ ہے کہ تفسیر قرآن کی بنیادی شرطوں کی تکمیل سے اس سے مسائل کا استنباط کیا جائے۔ مسائل سے مطلب معروف فقہی مسائل ہی نہیں بلکہ اس میں روحانیات و فقہیات کے جملہ مسائل شامل ہیں اور کتاب اللہ کا ہر حصہ ان کے لیے کسی نہ کسی درجہ میں ماخذ اور منبع کا مقام رکھتا ہے۔ دین کی سمجھ کے اعتبار سے امت میں بلا اختلاف سیدنا فاروق اعظمؓ کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ مختلف مواقع پر کتاب اللہ سے استنباط مسائل کی نسبت سے انھوں نے اپنی باریک بینی اور گہری نظر سے حضرات صحابہؓ کی پوری جماعت کو دم بخود کر دیا۔ صرفی و نحوی مسائل میں تعمق کو البتہ انھوں نے پسندیدگی

کی نگاہ سے نہیں دیکھا اور کتاب اللہ سے مطلوبہ استفادے کے لیے اس کو بڑی حد تک غیر ضروری قرار دیا[۳۶] اس کے نمونوں کو دیکھنا ہو تو تفسیر سے قطع نظر اپنے اپنے میدانوں میں آدمی فقہاء اور صوفیاء کی کتاب اللہ سے اخذ و استنباط کے نظائر کو دیکھے جنھیں عام طور پر کتاب اللہ پر غور و فکر کی نسبت سے ان کے قرار واقعی مرتبہ و مقام سے محروم رکھا جاتا ہے[۳۷] اخذ و استنباط کی یہ گہرائی اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جبکہ کتاب اللہ کے ایک ایک لفظ اور اس کے ایک ایک ٹکڑے سے آدمی نئے مضامین اور نئے مسائل کو تلاش کرنے کی اہلیت سے بھر پور ہو۔ اس پس منظر میں دین کے فہم اور اس کے مطلوبہ تفقہ کے سلسلے میں بالکل صحیح کہا گیا ہے:

لا یفقه العبد كل الفقه حتى يرى للقرآن وجوها[۳۸]	بندے کو دین کی قرار واقعی فہم اور سمجھ حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ قرآن کے ایک حصے کی کئی کئی زاویوں سے تشریح و تفسیر نہ کر سکے۔

اس کی روشنی میں عام تفسیروں سے ہٹ کر 'خلق الانسان ○ علمه البیان ○ (رحمٰن: ۳، ۴) میں بیان سے مراد شریعت' 'والصاحب بالجنب' (نساء: ۳۶) میں علاوہ دیگر کے بیوی کی شمولیت[۳۹]، خلق الانسان ضعیفا (نساء: ۲۸) کا مطلب یہ کہ انسان کے لیے اپنی جنسی خواہش پر قابو پانا دشوار ہے[۴۰]۔ اسی طرح ولا تواعدوهن سرا (بقرہ: ۲۵۰) میں 'سر' سے مراد مجامعت کی قوت یعنی کہ مرد طلاق / وفات کی عدت گزار رہی عورت سے اس کے دوران اپنی بڑھی ہوئی جنسی قوت کے حوالہ سے اسے آمادۂ نکاح کرنے کی کوشش کرے، حضرت امام شافعیؒ اسی تفسیر کے قائل ہیں، اس کی تائید میں امراؤالقیس کا یہ شعر بھی پیش کیا گیا ہے جس میں 'سر' کے معنی قوت مباشرت کے ہیں۔[۴۱]

الا زعمت بسباسة الیوم اننی — کبرت و ان لا یحسن السر امثالی

یا مثلاً آیت جزیہ میں 'وھم صاغرون' (توبہ: ۲۹) کی تفسیر میں حضرت امام شافعیؒ کا یہ نیا خیال کہ اہل ذمہ اسلامی ریاست کے ملکی قوانین برضا و رغبت قبول کر لیں اور ان کے سلسلے میں ان کے یہاں کسی مزاحمت کی کیفیت نہ رہے۔ الصغار ان یجری علیہم حکم الاسلام[۴۲] یا ایسے ہی فراہی مکتب فکر میں غیر معمولی شہرت یافتہ

'استعینوا بالصبر والصلوٰۃ' (بقرہ: ۱۵۳) میں صبر کی عام تفسیر سے ہٹ کر[۵۴] اس کی تفسیر روزہ سے[۵۵]۔ نمونے کی یہ مختلف اور متنوع تفسیریں عظمت قرآن کے لیے قادح نہیں، بلکہ اس سے کتاب اللہ کی وسعت اور اس کے معانی کے پہنائی کا ہی ثبوت فراہم ہوتا ہے جو اس کی بڑائی اور برتری کی دلیل ہے، عام روایت سے ہٹی متنوع تفسیر قرآن کی یہ پیش یا افتادہ مثالیں ہیں جنھیں مرتجلاً ہم نے پیش کیا ورنہ تفسیر سے ہٹ کر فقہ اور تصوف کی دنیا اس کے سلسلے میں بہت مالدار ہے گو کہ سکڑی معلومات کی حامل اور محدود مطالعہ کی خوگر امت کی اکثریت کو اس کا پتہ نہ ہو اور علم و معرفت کے ان انمول خزانوں سے اس کا دامن خالی ہو۔

فہم قرآن کا ایک حجاب بے لچک تقلید

آخری بات سے پہلی بات یہ کہ فقہ کی طرح قرآن کی تفسیر کا اصل مزہ بھی بے لچک تقلید سے آزادی میں مضمر ہے۔ بے لچک تقلید چاہے وہ تفسیر کے کسی بھی مکتب فکر کی ہو حقیقت کے اعتبار سے وہ فہم قرآن کا حجاب ہے۔ حجۃ الاسلام غزالیؒ نے اپنی شاہکار 'احیاء العلوم' میں اگرچہ اس نکتے کی طرف اشارہ تفسیر ماثور اور کلامی مسائل میں کسی خاص توجیہ پر اصرار کے حوالہ سے کیا ہے[۵۶] لیکن سچ یہ ہے کہ اس کا دائرہ اس سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ آزاد غور و فکر کی صلاحیتیں، اس کے آداب اور شرطوں کی تکمیل اور اس کے حدود کی رعایت پر قابو کے باوجود تقلید جامد پر اصرار اس دین میں سب سے بڑا گناہ ہے۔ دراصل یہ علم کی دنیا ہی کا سب سے بڑا حجاب ہے۔ بلکہ اس سے آگے کی بات یہ کہ اس امت کا سیاسی زوال بھی اس کے علمی زوال کے ہم رکاب ہے۔ چوتھی صدی ہجری جو فقہ میں اجتہاد کی آخری صدی مانی جاتی ہے[۵۷] اسی کے بعد سے مسلمانوں کے سیاسی اور قومی زوال کا آغاز ہوتا ہے۔ علوم اسلامی کے دوسرے تمام دائروں میں تو بے لچک تقلید ان کا حجاب اور ان کے راہ کی رکاوٹ ہے ہی، قرآن کے فہم و تدبر کے سلسلے میں بھی اس حجاب اور اس رکاوٹ کو اس سے کم اہمیت دینا صحیح نہ ہوگا۔ معلوم ہے کہ ہمارے ذخیرۂ تفسیر میں مختلف تفسیروں کا مختلف رنگ ہے۔ کہیں تفسیر ماثور کا زور ہے تو کہیں عقلی تفسیر کی چھاپ گہری ہے۔ کہیں صرف و نحو کی طرف زیادہ توجہ ہے تو کہیں

احکام و فقہ کا غلبہ ہے۔ آدمی ان تمام رنگ کی تفسیروں سے استفادہ کرے لیکن حضرت امام غزالیؒ کے بقول تفسیر کی کسی ایک رائے اور آیتِ کریمہ کی کسی ایک توجیہ و تعبیر کو ہی حرف آخر تسلیم کر کے آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ تقلید کے اس حجاب کے ساتھ فہم قرآن کی کلید اس کے ہاتھ نہیں آسکتی۔ استفادہ سب سے کیا جائے لیکن کتاب اللہ کے حقیقی منشا و مراد کو کسی ایک تفسیر یا تعبیر کا پابند نہ سمجھا جائے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ سخت گیر نظم قرآن کی تقلید کو اس عام اصول سے کیونکر مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔ فی الجملہ نظم قرآن کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے مواقع کی تفصیل میں نئے گوشوں کی نشاندہی کی جا سکتی ہے اور سخت گیر نظم کا قائل نہ ہو کر بھی کتاب اللہ کے دروازے کو اپنے لیے بند نہیں سمجھنا چاہیے۔ حجۃ الاسلام غزالیؒ کا یہ نکتہ فہم قرآن کے معروف حدود و شرائط پر اضافہ ہے جو قابلِ توجہ ہے۔

نظمِ قرآن — متوازن نقطۂ نظر:

حاصل کلام یہ کہ فی الجملہ کتاب اللہ میں نظم و ترتیب کے اعتراف کے ساتھ سخت گیر نظم قرآن جیسا کہ خاص مکتب فکر کی طرف سے کہا جاتا ہے، اس پر اصرار مناسب نہیں۔ تنہا اسے ہی جس طرح فہم قرآن کی کلید باور کرایا جاتا ہے وہ مبالغہ آمیز ہے۔ تاریخ کے بے لاگ جائزے سے فائدے کے مقابلے میں اس کا نقصان زیادہ نظر آتا ہے۔ اس کے نمائندہ لٹریچر میں سب سے نمایاں تفسیر تدبر قرآن ہے جس کی بے اعتدالیوں کے لیے ایک الگ کتاب کی ضرورت ہے۔ لیکن اس سے بڑی تاریخی غلطی یہ کہ مدرسۃ الاصلاح کو نظم قرآن کے داعی اور وکیل کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ مولانا فراہیؒ بلاشبہ اس مدرسہ کے بہت بڑے محسن ہیں، اس کے اعتراف میں مدرسہ کے اندر ان کے علوم و افکار کے مطالعہ کے لیے ایک مخصوص چیئر قائم کی جا سکتی ہے، حدود مدرسہ میں ان کے افکار کا خصوصی حوالہ اور چرچا بھی ہو سکتا ہے جو عین تقاضائے احسان شناسی ہے۔ لیکن یہ انصاف کے خلاف ہے کہ کسی ادارہ کو اس کے دستور اور نصب العین سے ہٹا کر ذاتیات اور شخصیات کے گرد گھمایا جائے۔ پون صدی کے عرصے میں حدیث و فقہ سے بے اعتنائی کے ساتھ اس میں جو کمزوری پیدا ہوئی ہے اس کے تقاضے سے فوری طور پر مادر علمی سے نظم قرآن کے بوجھ کو کم کرنا چاہیے۔ سائنس کی نئی آفت سے

ہٹ کر اس کے پہلے قدم کے طور پر مدرسۃ الاصلاح میں اسباق النحو، تحفۃ الاعراب اور امثال آصف الحکیم کی پہلے سے شامل نصاب مولانا فراہیؒ کی کتابوں کے علاوہ 'دلائل النظام' اور 'التکمیل' جیسی دوسری تمام کتابوں کو جو ماضی قریب میں اس میں شامل کی گئی ہیں، انھیں نصاب سے خارج کیا جائے۔ علوم میں زیادہ اصولوں کا چکران کی راہ کی رکاوٹ ہے، اصول فقہ میں غلو اور کتابوں کی کثرت کو اگر بجا طور پر بے اصل اور بے سود 'لغو' کہا گیا ہے[۳۹] تو اصول تفسیر کے معاملے کو اس سے مختلف نہ ہونا چاہئے۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ دیگر علوم کے مقابلے کتاب اللہ اصول کی بھول بھلیوں سے اس سے زیادہ بے نیاز ہے۔

مادر علمی کے دستور میں قرآن، حدیث، فقہ اور ادب عربی کے ساتھ شدت اعتناء کی جو بات کہی گئی ہے[۴۰]۔ اسے اسی دائرے میں محدود رکھا جائے۔ قرآن سے شدت اعتناء کو افکار فراہیؒ سے شدت اعتناء کے مرادف قرار نہ دیا جائے۔ مدرسۃ الاصلاح کا اصل مابہ الافتخار اس کا رجوع الی القرآن کا پیغام ہے۔ بے اعتدالیوں سے بچتے ہوئے اسی پیغام کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ مدارس عربیہ کا مقصد امت کی متنوع دینی ضروریات کی تکمیل ہے۔ صرف نظم قرآن کی بانسری بجانے سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ مولانا فراہیؒ کے اعتراف کے لیے مادر علمی میں صرف 'دائرہ حمیدیہ' کافی ہے۔ پورے مدرسے کو افکار فراہی کے گرد گھمانا نری بے اصولی اور خلاف انصاف ہے۔ اس پس منظر میں مدرسہ کی مرکزی انجمن طلبہ قدیم کو جو دائرۂ حمیدیہ کا ضمیمہ بنا دیا گیا ہے تو یہ خود اس فورم کے ساتھ بے انصافی اور اس کے قرار دادہ مقاصد کے علی الرغم ہے۔ مدرسۃ الاصلاح کے ساتھ سر دست اس کی طلبہ قدیم مرکزی بھی اسی طرح اصلاح طلب ہے۔

حواشی وحوالہ جات

[۱] اس کے قائلین میں ایک اپنے وقت کے درویش صفت شیخ الازہر، قواعد فقہیہ کے بیان میں معرکۃ الآرا کتاب 'قواعد الاحکام فی مصالح الانام' کے مصنف شیخ عزالدین عبد السلام م ۶۶۰ھ، جن کا تذکرہ خود مولانا فراہیؒ نے اپنے مقدمہ تفسیر میں کیا ہے، فاتحہ تفسیر نظام القرآن وتاویل الفرقان بالفرقان/ ۲، مطبعۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ ۱۳۵۷ھ بعد کے لوگوں میں اس سلسلے کا دوسرا نمایاں نام صاحب فتح القدیر قاضی شوکانی م ۱۲۵۰ھ

کا ہے۔ دیکھئے ان کی تفسیر فتح القدیر الجامع بین فنی الروایۃ والدرایۃ من علم التفسیر: ۱/۷۲،۷۳، دار المعرفۃ بیروت۔

۲؎ اس طبقے کے ممتاز ناموں میں صاحب تفسیر کبیر امام رازی م ۶۰۶ھ، علامہ آلوسی صاحب روح المعانی م ۱۲۷۰ھ اور اردو مفسرین میں مولانا اشرف علی تھانوی صاحب بیان القرآن م ۱۳۶۲ھ صاحب تفہیم القرآن مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو بھی اسی طبقے میں رکھنا مناسب ہے۔ ان حضرات کی تفسیروں میں جا بجا اس التزام کے نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔ مولانا فراہیؒ کے ذکرکردہ صاحب احکام القرآن ابن عربی کو بھی اسی طبقے میں شامل کیا جانا مناسب ہے۔ اسی موقع پر مولانا فراہیؒ نے امام رازی کا بھی تذکرہ کیا ہے، فاتحہ/ ۵، طبع مذکور۔

۳؎ اس کے مشہور ناموں میں شیخ ابوحیان، برہان الدین بقاعی، ابوبکر نیشاپوری، مخدوم مہائمیؒ اور شیخ ولی الدین ملوی شامل ہیں جن کا فطری طور پر فاتحہ نظام القرآن میں اہتمام سے ذکر ہے، فاتحہ: ا تا ۵، محولہ بالا۔ خیال رہے کہ حضرت مجدد صاحب مہائمی کی تفسیر تبصیر الرحمٰن کو پسند نہیں کرتے جو کتاب اللہ کی تفسیر میں حکماء فلاسفہ کی آراء کو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ برابر کی اہمیت سے بیان کرتے ہیں یہاں تک کہ اس کے مطالعہ کو بھی ضرر سے خالی خیال نہیں کرتے۔ مکتوبات امام ربانی: ۲/۱۶۰ مکتوبات ۱۰۱ - اردو ترجمہ از مولانا محمد سعید نقش بندی، فیصل پبلشنگ ہاؤس، دیوبند ۱۹۸۸ء طبع اول۔

۴؎ اور ان کے ساتھ ان کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحی حفظہ اللہ نے اپنی تفسیر تدبر قرآن میں اس کا پوری شدت سے التزام کیا ہے اور اس حیثیت سے بالخصوص اردو ذخیرۂ تفسیر میں اس کی امتیازی حیثیت مسلم ہے۔ بعد کی پیڑھی میں دوسرا قابل ذکر نام مولانا عنایت اللہ سبحانی جن کا علامہ فراہی کے نظم قرآن پر پی ایچ ڈی مقالہ البرہان فی علوم القرآن، ضخیم کتاب کی صورت میں منظر عام پر آچکا ہے۔ فراہی مکتب کا یہ خاص امتیاز باور کیا جاتا ہے جس کے مراکز میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر علاوہ اس کے متنی جامعۃ الفلاح بلریا گنج کو بھی بحالات موجودہ اسی طرح شامل کیا جاسکتا ہے۔

۵؎ اس کے نمایاں ناموں میں علامہ ابن قیم م ۷۵۱ھ کی اعلام الموقعین اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی م ۱۱۷۶ھ کی حجۃ اللہ البالغہ، اردو کتابوں میں اس نسبت سے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی م ۱۳۶۲ھ کی 'المصالح العقلیہ للاحکام النقلیہ' بھی قابل ذکر ہے جو بعض اوقات اپنے پیش رووں پر اضافہ کرتی ہے۔

۶؎ مولانا تھانویؒ نے اپنی مذکورہ کتاب کے مقدمہ میں یہ بات کہی گئی صفحات ۲ تا ۴، مطبوعہ ادارہ اشرف العلوم دیوبند ۱۳۶۱ھ اور حجۃ اللہ کے مقدمہ: ۱/۲ میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔ کتب خانہ رشیدیہ، دہلی 'المصالح العقلیہ' میں اس موضوع پر دو اور عربی کتابوں مصری فاضل ابراہیم آفندی کی 'اسرار شریعت' اور ایک رسالے 'رسالہ حمیدیہ' کا بھی تذکرہ ہے، صفحات ۴، ۵، محولہ صدر۔

۷ علامہ ابن تیمیہ م ۷۲۸ھ اپنے فتاویٰ میں 'ترتیب السور کان مفوضا الی اجتہادھم'، ترتیب آیات السور منصوص، فتاویٰ ابن تیمیہ : ۳۹۶، ۴۰۹، ۴۱۰، طبع جدید سعودی عرب، ترتیب عبدالرحمٰن بن قاسم وابنہ محمد۔ اسی کے قائلین میں حضرت امام مالک اور قاضی ابوبکر ابن عربی صاحب احکام القرآن بھی ہیں، لیکن مضبوط بات یہی ہے کہ آیتوں کی طرح سورتوں کی ترتیب بھی توقیفی اور حق سبحانہ وتعالیٰ کی وحی کردہ ہے جس کے قائلین میں ابوجعفر نحاس، ابن الحصار اور حافظ ابن حجر ہیں اور علامہ سیوطی کا واضح رجحان بھی اسی رائے کی طرف ہے۔ ملاحظہ کیجئے: الاتقان فی علوم القرآن : ۱/۶۲، ۶۳، مطبعہ ازہریہ، مصر ۱۳۴۳ھ / ۱۹۲۵ء طبعہ ثانیہ۔

۸ روایت احمد و ابوداؤد بحوالہ: الاتقان/۶۳، محولہ بالا۔ مزید ملاحظہ ہو: قاضی مظہرالدین احمد بلگرامی: عیون العرفان فی علوم القرآن صفحات ۷۸ تا ۸۰، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ دسمبر ۱۹۸۰ء طبع اول تلاوت قرآن میں حضرات صحابہؓ کے دیگر معمولات کے لیے : الاتقان فی علوم القرآن : ۱/۱۰۴، محولہ بالا۔

۹ الاتقان : ۱/۶۲، نیز: ۱۰۴، ۱۰۵۔ آخری آیت کریمہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر 'واتقوا یوما ترجعون فیہ الی اللہ'، نازل ہوئی جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبرئیل نے سورۂ بقرہ کی آیت ربا اور آیت دین ۲۸۰، ۲۸۲، کے بیچ ۲۸۱ پر رکھنے کے لیے کہا۔ دوسرے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت کریمہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے صرف سات دن قبل نازل ہوئی، التبیان فی علوم القرآن للصابونی ص ۵۵، مکتبہ الغزالی دمشق اور موسستہ مناہل العرفان، بیروت ۱۴۰۱ھ / ۱۹۸۱ء، طبعہ ثانیہ۔

۱۰ اس سلسلے کا سب سے نمایاں نام ابوحیان اندلسی م ۷۴۵ھ کی 'البرہان فی ترتیب سور القرآن'، مدرسۃ الاصلاح کے کتب خانے میں اس کے مخطوطہ پر مولانا مسعود عالم ندوی ۹ صفر المظفر ۱۳۵۹ھ کا تحریر کردہ یہ نوٹ ہے: —
"المنقول عن النسخۃ الخطیۃ المحفوظۃ فی الخزانۃ الشرقیۃ العمومیۃ بمدینۃ عظیم آباد برقم ۲۱۰۔ نقلہ بعض الطلبۃ بمدرسۃ شمس الہدی وعرضوہ علی الام المنقول عنہا الا انہ بقی فیہ شئ من الاخطاء لم یتمکنوا من تصحیحہا ولم اتفرغ لازالۃ ھذہ عسی ان یوفق اللہ اصحاب ھذہ النسخۃ للمقابلۃ والطبع"۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا فراہی کے نظم قرآن پر مولانا سبحانی کی مذکورہ عربی کتاب اسی مخطوطہ کا چربہ ہے، اس پس منظر میں ان دونوں کا تقابلی مطالعہ ایک دلچسپی کا موضوع ہے۔

۱۱ قرآنی سورتوں کے جوڑے جوڑے ہونے کا فلسفہ، تفصیل کے لیے: مقدمہ تدبر قرآن ل م، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، طبع سوم ۱۹۷۶ء۔

۱۲ خیال رہے کہ مولانا فراہیؒ سورۂ حج کو مدنی اور ہجرت کے فوراً بعد کی نازل کردہ مانتے ہیں، دلائل النظام،

صفحات ۹۲، ۹۶، الدائرۃ الحمیدیۃ ومکتبھا، طبع اولیٰ ۱۳۸۸ھ۔ البتہ ان کے شاگرد رشید کا اصرار ہے کہ ۳۸ تا ۴۱ چار آیات کے سوا یہ پوری سورہ مکی ہے۔ تدبر قرآن: ۴/۳۴۱، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء۔ زمخشری بھی چھ آیات کے علاوہ باقی پوری سورہ کو مکی مانتے ہیں۔ الکشاف عن حقائق التنزیل: ۳/۳، مصطفی البابی الحلبی واولادہ، مصر، الطبعۃ الاخیرۃ ۱۳۹۲ھ/۱۹۷۲ء۔

۱۳؎ اس موقع پر نظم قرآن سے امت کی غفلت یہود و نصاریٰ کی روش کے مشابہ قرار دیتے ہوئے یحرفون الکلم عن مواضعہ (مائدہ: ۱۳) 'فنسوا حظا مما ذکروا بہ فاغرینا بینھم العداوۃ والبغضاء الی یوم القیامۃ (مائدہ: ۱۴) آیات قرآنی کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ استاذ امام کے اس مضمون کو نقل کرنے کے ساتھ دلائل النظام کے مرتب نے 'کلمۃ الجامع' میں بھی اسی آیت کریمہ کو نقل کرنے کو ضروری خیال کیا ہے۔ دلائل النظام ص۵، محولہ بالا کورانہ تقلید کی اس سے بہتر مثال ڈھونڈنی مشکل ہے۔

۱۴؎ آل عمران: ۱۱۰ ۱۵؎ لن یزال امر ھٰذہ الامۃ مستقیما حتی تقوم الساعۃ او حتی یاتی امر اللہ عزوجل، بخاری جلد ۲، کتاب الاعتصام، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا تزال طائفۃ من امتی ظاھرین علی الحق اصح المطابع دھلی۔ نیز مسلم جلد ۱۔ کتاب الایمان، باب نزول عیسی بن مریم حاکما بشریعۃ نبینا محمد صلی اللہ علیہ وسلم، مطبعۃ عامرہ، مصر۔ اس مضمون کی دیگر احادیث کے لیے مشکوٰۃ المصابیح جلد ۲ کتاب الفتن، باب ثواب ہٰذہ الامۃ، کتب خانہ رشیدیہ دہلی۔

۱۶؎ 'لا تجتمع امتی علی ضلالۃ' روایت، ترمذی و ابوداؤد۔ الفاظ ترمذی کے۔ اس کی سند میں کمزوری ہے لیکن امام حاکم نے اس کے دوسرے شواہد نقل کیے ہیں جس سے اس کے مضمون کو قوت مل جاتی ہے۔ وفی سندہ ضعف لکن اخرج لہ الحاکم شواھد، بحوالہ الورقات للجوینی ۶/۴ مشمولہ مجموع متون اصولیہ، مکتبۃ الاصلاح سرائے میر، ربیع الاول ۱۴۰۲ھ، طبع اولیٰ۔

۱۷؎ الورقات للجوینی، محولہ بالا۔

۱۸؎ دو جنازوں کے گزرنے پر حضرات صحابہؓ کے دو مختلف ردعمل، جس کی توثیق کرتے ہوئے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں 'شہداء اللہ فی الارض' کی بشارت سے نوازا، بخاری جلد ۱ کتاب الجنائز، باب ثناء الناس علی المیت، نیز مسند احمد بن حنبل: ۲/۲۶۱، ۳/۱۷۹، میمنہ، مصر۔

۱۹؎ فاتحہ نظام القرآن اور حکمۃ الجامع فی دلائل النظام، محولہ بالا در حاشیہ ۱۳۔

۲۰؎ بعض پہلوؤں سے مکتب فراہی کے سب سے ممتاز ترجمان مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی 'تفسیر سورۂ فیل

کو مولانا فراہیؒ کی نری اپج قرار دیتے تھے۔ اس کی نسبت سے بعض قابل احترام بزرگوں نے جو التباس پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ مولانا ابو اللیثؒ سے راقم کا یہ براہ راست استفادہ ہے۔

۲۱ه انعام : ۴۲، اعراف : ۵۹، ہود : ۲۵، نحل : ۶۳، مریم : ۱۷، مومنون : ۲۳، وغیرہ دیگر آیات۔

۲۲ه جلالین / ۲۱۱، دار المعرفۃ، بیروت ۱۴۰۳ھ / ۱۹۸۳ء، طبع اولیٰ۔ موضح القرآن / ۷۷۲، تاج کمپنی لاہور۔

۲۳ه صاحب جلالین نے 'رجز' کی تفسیر 'عذاب' ہی سے کی ہے۔ تفسیر الجلالین / ۲۱۱، محولہ بالا۔

۲۴ه نیز حم السجدہ : ۱۶ 'فارسلنا علیہم ریحا صرصرا فی ایام نحسات لنذیقہم عذاب الخزی فی الحیوٰۃ الدنیا، ولعذاب الاخرۃ اخزیٰ وھم لاینصرون' نیز ذاریات : ۴۱، ۴۲ 'وفی عاد اذ ارسلنا علیہم الریح العقیم ۝ ما تذر من شئ اتت علیہ الا جعلتہ کالرمیم ۝ تعجب ہوتا ہے کہ مولانا فراہیؒ جیسے ماہر لغت اور اسالیب قرآن کے رمز آشنا کی نگاہ اس طرف کیسے نہیں گئی۔ اپنی تفسیر سورۂ فیل میں جو انھوں نے قمر : ۳۴ کا حوالہ دیا بھی ہے تو وہ 'حاصب' کی تحقیق کے ذیل میں ہے۔ 'ارسلنا علیٰ' کے موقع استعمال سے انھوں نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ تفسیر سورۂ فیل اردو ترجمہ / ۶۷، دائرہ حمیدیہ، طبع دوم۔ قدیم عربی شاعری سے جو انھوں نے اپنے موقف کی تائید کرنے کی کوشش کی ہے تو وہ چند در چند کمزوریوں کی شکار ہے جس کے لیے الگ صحبت درکار ہے۔ جنگ جمل میں دس ہزار سے اوپر اور صفین میں جانبین سے ستر ہزار کے قریب افراد مارے گئے (تاریخ اسلام : ۱/ ۴۶۰، ۴۸۱ از مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی، تاج کمپنی دہلی) سوال یہ ہے کہ جب ان کی لاشوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے آسمان سے چڑیوں کی خصوصی مدد کی ضرورت نہیں ہوتی تو ابرہہ کے لشکریوں ہی کے لیے اس کی ضرورت کیوں پیش آئی جبکہ اس کے مقتولین کی کسی تعداد کی صراحت خود صاحب تفسیر سورۂ فیل نے نہیں کی ہے۔ اہتمام طلب کلمہ گو مسلمانوں کی اس بڑی تعداد میں لاشوں کے مسئلہ کو جب اہل عرب نے حل کر لیا تو غیر مسلم فوج کی لاشوں کے ٹھکانے لگانے کے مسئلے کو تو اس سے بہر حال آسان ہونا چاہئے۔ دوسرے ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ ابرہہ کی فوج کی کل تعداد ساٹھ ہزار تھی، تفہیم القرآن / ۴۶۶ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۷۳ء طبع سوم۔ الرحیق المختوم / ۷۷، مجلس علمی، علی گڑھ ۱۴۰۸ھ / ۱۹۸۸ء، طبع اول۔

۲۵ه صاحب تفہیم القرآن نے 'صیحۃ' کی ترجمانی جو 'دھماکے' سے کی ہے وہ صحیح نہیں معلوم ہوتی، اردو ترجمہ قرآن مع مختصر حواشی / ۱۳۴۹، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔ دھما کا عربی لفظ 'تفجر' یا 'انفجار' کا ترجمہ ہے۔ اردو مترجمین نے عام طور پر اس کا ترجمہ 'چنگھاڑ' سے کیا ہے، یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ تفسیر عثمانی میں یہ صراحت ہے کہ یہ 'چیخ فرشتے نے ماری تھی جس سے کلیجے پھٹ گئے اور سب چورا ہو کر رہ گئے۔ ترجمہ شیخ الہند مع تفسیر عثمانی / ۶۸۷، تاج کمپنی (دہلی)

۲۶؎ مولانا امین احسن اصلاحی حفظہ اللہ اپنی تفسیر تدبر قرآن میں، مزید تفصیل کے لیے ہمارا مضمون 'ترجمان القرآن فراہی کا مسلک حدیث، تحقیقات اسلامی جنوری - اپریل ۹۴ء۔

۲۷؎ مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی کی تازہ تصنیف 'حقیقت رجم' ادارہ احیائے دین، بلریا گنج، اعظم گڑھ (یوپی) جسے مجموعہ اغلاط اور مجموعہ التباسات کے علاوہ دوسرا نام نہیں دیا جاسکتا ہے۔ کاش کہ ہمارے بزرگ تقلید اعمیٰ سے ہٹ کر اپنی صلاحیتوں کو دین کی علمی خدمت کے پھیلے ہوئے دوسرے دائروں میں استعمال کرتے۔ تحریک اسلامی سے وابستہ افراد کی اس طرح کی لاطائل علمی دلچسپیاں اور بھی قابل افسوس ہیں۔ مولانا سبحانی نے اپنے اوقات کے ضیاع کے ساتھ دوسرے عالم کے بھی تضیع اوقات کا سامان کیا۔ اس کتاب کے پیدا کردہ فکری انحراف کی اصلاح امت پر بطور فرض کفایہ واجب ہے۔ وفی ذالک فلیتنافس المتنافسون۔

۲۸؎ تدبر قرآن: ۶/ ۴۵۱، فاران فاؤنڈیشن، لاہور طبع دوم ۱۴۰۲ھ ۱۹۸۲ء الفاظ ہیں: "تیسری یہ کہ 'تعزیر' اور 'توقیر' کے الفاظ اللہ تعالیٰ کے لیے موزوں نہیں ہیں، یہ اپنے مواقع استعمال کے لحاظ سے رسول ہی کے لیے موزوں ہیں۔ 'توقروہ' کا لفظ تو اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل ہی ناموزوں ہے"۔

۲۹؎ الموافقات للشاطبی: ۱/ ۷۷ - ۸۱، مکتبہ تجاریہ کبریٰ، مصر۔ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے جوامع الکلم میں اس پوری بحث کو ایک جملے میں سمیٹ دیا گیا ہے: العلم ثلاثۃ آیۃ محکمۃ اوسنۃ قائمۃ اوفریضۃ عادلۃ وما کان سوی ذالک فھو فضل۔ روایت عبداللہ عمرؓ بحوالہ ابوداؤد وابن ماجہ۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب العلم، فصل ثانی کتب خانہ رشیدیہ دہلی۔

۳۰؎ الکشاف عن حقائق التنزیل: ۲/ ۵۳۶، مصطفی البابی الحلبی واولادہ مصر، الطبعۃ الاخیرۃ ۱۳۹۲ھ ۱۹۷۲ء باقلانی جو قرآن کے اعجاز کے دس وجوہ بیان کرتے ہیں ان میں بھی ایک اس کے نظم کو اسی معنیٰ میں قرار دیتے، اعجاز القرآن للباقلانی م ۴۰۳ھ ہامش الاتقان للعلامۃ السیوطی م ۹۱۱ھ: ۱/ ۵۱ محولہ بالا باقلانی نے یہ جو دس وجوہ بیان کیے ہیں۔ زمخشری نے ان سب کو دو جہتوں میں سمیٹ دیا ہے: انہ کتاب معجز من جہتین من جہۃ اعجاز نظمہ، ومن جہۃ مافیہ من الاخبار بالغیوب (الکشاف: ۲/ ۲۳۸، نیز ۲۶۲، محولہ بالا) اصول فقہ میں شریعت کے ماخذ اول کی حیثیت سے کتاب اللہ کی جو تفصیل نظم و معانی سے کی جاتی ہے (مختصر المنار/ ۱، مشمولہ مجموع متون اصولیہ، محولہ صدر) تو یہاں بھی نظم سے مراد فراہی مکتب فکر سے ہٹ کر یہی آیات کا اندرونی دروبست اور اس کے لفظ اور ترکیب سے متعلق مسائل ہیں۔

۳۱؎ اس سلسلے کا بہت ہی نمایاں نام صاحب سنن ابوداؤد امام ابوداؤد سجستانی م ۲۷۵ھ کی قرآنیات

پر دوسری دو کتابوں "شریعۃ القرآن" اور "شریعۃ التفسیر" کے علاوہ خاص طور پر ان کی کتاب "نظم القرآن" جسے تلاش و جستجو سے منظر عام پر لانے کو امت پر فرض کفایہ ہونا چاہیے ۔ ملاحظہ کیجئے : طبقات المفسرین : ۱/۲۳۷، دارالکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء، طبعہ اولی ۔

۳۱ روایت ترمذی و دارمی بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح /۱۸۶، کتاب فضائل القرآن، فصل ثانی ، طبع مذکور ۔

۳۲ امام ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ ، محولہ بالا ۔

۳۳ روایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، شرح السنۃ بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح ، کتاب العلم ۔ فصل ثانی ۔

۳۴ نیز : لقمان : ۲۷، یہاں اور کہف : ۱۰۹ میں کلمات اللہ سے مراد قرآن اور وحی ہے اس کی وضاحت کہف ۲۷ ، سے ہوتی ہے ۔ واتل ما اوحی الیك من کتاب ربك لا مبدل لکلمٰتہ ولن تجد من دونہ ملتحدا ہ

۳۵ حشر : ۱۰ ، والذین جاء و امن بعدھم الآیہ سے استدلال کرتے ہوئے سواد عراق کی مفتوحہ زمینوں کو مجاہدین میں تقسیم نہ کرکے ریاست کے ذریعہ اس کے بندوبست کی فاروقی رائے ، فقہا صحابہؓ میں حضرت علیؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کی بھی یہی رائے تھی ، بلکہ ابتداءً فاروق اعظمؓ کے سامنے اس کا سجھاؤ انہی حضرات کی طرف سے آیا تھا ۔ کتاب الاموال لابی عبید /۶۱-۶۳ ۔ مکتبۃ الکلیات الازہریۃ ۔ مصر ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء ، طبعہ ثانیہ ۔

۳۶ کتاب اللہ کے الفاظ 'اب' (فاکھۃ وابا : عبس : ۳۱) اور تخوف ' اویاخذھم علی تخوف : کے سلسلے میں حضرت فاروق اعظمؓ کا ردعمل کہ ان تحقیق میں پڑنا تکلف اور بہت زیادہ عملی ضرورت نہ ہو کر غیر ضروری ، الموافقات للشاطبی : ۱/۵۳، ۵۴، ۵۵ ، محولہ بالا ۔

۳۷ تصوف کے اولین بنیادی مراجع سے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح و تفسیر میں حضرات صوفیاء عظام کے اچھوتے اور نادر نکات کو جمع کیا جا سکے تو بہترین تفسیر کے ساتھ حدیث نبویؐ کی لاجواب شرح تیار ہو ۔ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے مسلمان علماء اور اسکالروں کے لیے دعوت سخن ۔

۳۸ جامع بیان العلم لابن عبدالبر : ۲/۴۵ ، ادارۃ الطباعۃ المنیریہ (مصر) دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء

۳۹ جامع البیان : ۲۷/۶۱ ، میمنیہ ، مصر ۔

۴۰ احیاء علوم الدین : ۲/۲۸۱ ، مکتبہ تجاریہ کبری ، مصر ۔ مطبعۃ الاستقامہ ، قاہرہ ۔

۴۱ احیاء علوم الدین : ۲/ محولہ بالا ۔

۴۲ فتح القدیر للشوکانی : ۱/۲۵۰ ، دارالمعرفۃ ، بیروت

۴۳ الاحکام السلطانیہ للماوردی /۱۴۳ ، مصطفی البابی الحلبی واولادہ ، مصر ۱۳۹۳ھ/۱۹۷۳ء ، طبعہ ثالثہ ۔

۴۴ه فراہیات کے پھیلے ہوئے لٹریچر میں جابجا اس کے نمونوں کے علاوہ بالخصوص 'اساس دین کی تعمیر' میں نماز اور صبر کی بحث۔ مصنفہ مولانا صدرالدین اصلاحی، مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔ ۴۵ه احیاء: ۱/۴/ ۲۸۴، ۲۸۵،

۴۶ه ردالمحتار مع الدرالمختار: ۱/۱۵۵، مطبعۃ عثمانیہ، مصر إن القیاس بعد الاربعۃ منقطع" الخ

۴۷ه مقدمہ ابن خلدون ۴/۹۴، مطبعۃ بہیہ مصر (بدون سنہ)

۴۸ه دستورالعمل مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ منظور کردہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۸ء مطبوعہ حمیدیہ پریس سرائے میر۔ دفعہ ۴۔ کے الفاظ ہیں: "اصلی مقصد اس مدرسہ کا مسلمانوں کی مذہبی اور دنیوی تعلیم ہے' اور بوقت توسیع مذہبی تعلیم کو مقدم رکھا جائے گا۔" ص۲ آگے دفعہ ۵ کے تحت انتظام تعلیم میں مدرسہ کی خصوصیات کے بیان کا پہلا نکتہ ہے۔ (الف) "قرآن وحدیث وفقہ وادب عربی کی طرف شدت اعتناء"

فاعتبروا یا اولی الابصار۔

اعلان ملکیت سہ ماہی تحقیقات اسلامی۔ فارم ۴ رول ۸

۱۔ مقام اشاعت: پان والی کوٹھی۔ دودھ پور، علی گڑھ یوپی

۲۔ نوعیت اشاعت: سہ ماہی

۳۔ پرنٹر پبلشر: سید جلال الدین عمری

۴۔ قومیت: ہندوستانی

پتہ: پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ۔ یوپی

۵۔ ایڈیٹر: سید جلال الدین عمری

پتہ: پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ، یوپی

۶۔ ملکیت: ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی

پان والی کوٹھی، دودھ پور۔ علی گڑھ، یوپی

بنیادی ارکان کے اسمائے گرامی

(۱) مولانا محمد فاروق خاں (صدر) ۱۳۵۳، بازار چتلی قبر، دہلی ۶

(۲) جناب سید یوسف (رکن) ابوالفضل انکلیو نئی دہلی

(۳) ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی۔ فریدی ہاؤس سر سید نگر علی گڑھ

(۴) جناب امین الحسن رضوی (رکن) دلشاد گارڈن نئی دہلی۔

(۵) ڈاکٹر محمد رفعت۔ شعبۂ فزکس۔ جامعہ ملیہ۔ نئی دہلی۔

(۶) مولانا کوثر یزدانی ۱۳۵۲۔ بازار چتلی قبر۔ دہلی۔

(۷) ٹی۔ کے عبداللہ صاحب الاتقن کنڈی ہاؤس، پیری کالی کٹ

(۸) ڈاکٹر حمیداللہ۔ مزمل منزل کمپلیکس۔ علی گڑھ

(۹) ڈاکٹر احمد سجاد۔ بریاتو ہاؤسنگ سوسائٹی، کالونی طارق منزل رانچی

(۱۰) ڈاکٹر عبدالحق انصاری۔ امریکا

(۱۱) سید جلال الدین عمری (سکریٹری) مزمل منزل علی گڑھ

پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ۔

مندرجہ معلومات میرے علم ویقین کی حد تک بالکل درست ہیں۔

پبلشر: سید جلال الدین عمری

حزب الرفاہ اور اس کا اسلامی تناظر

ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی

ترکی میں مارچ ۱۹۹۴ء کے بلدیاتی انتخابات کے نتائج نے حکمرانوں کی راتوں کی نیند اڑا دی ہے، وہ حزب مخالف کے رہنماؤں سے مل کر اور اسرائیل و امریکہ کی امداد حاصل کر کے حزب الرفاہ اور اس کے رہنما پروفیسر نجم الدین اربکان کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں۔ ۱۳ اپریل کو انقرہ میں رفاہ کے صدر نے ایک بیان میں کہا کہ "حزب الرفاہ اقتدار میں آ رہی ہے اب یہ سوچنا ۶۰ ملین ترکی عوام کا کام ہے کہ اقتدار کی یہ منتقلی پرامن طریقے سے ہوگی یا خوں ریزی ناگزیر ہوگی۔" انقرہ کے سرکاری وکیل نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ اس سے قانون کی خلاف ورزی ہوئی ہے اور انھیں اسٹیٹ سیکورٹی کورٹ کے سامنے جواب دہی کرنی ہوگی۔ حالیہ بلدیاتی انتخاب میں اسلام پسندی کے لیے معروف اس سیاسی جماعت کو جو فتح حاصل ہوئی ہے اس کے اسباب پارٹی کے اصول وضوابط، بے لوث مخلصانہ کردار کے علاوہ خود ترکی حکومت کی داخلہ وخارجہ پالیسیوں کا ابہام، تضاد اور منافقانہ روش ہیں۔

پچھلے کئی سالوں سے کردستان کا مسئلہ ترکی حکومت کے لیے کافی مشکلات کا باعث بنا ہوا ہے اور یہ ترکی قومیت ہی کا پیدا کردہ ہے۔ خلافت عثمانیہ کے آخری ادوار میں مغربی طاقتوں نے ترک قومیت کو خوب ہوا دی اور مغربی فکر سے مرعوب ومتاثر مصطفیٰ کمال اتاترک (۱۸۸۱ — ۱۹۳۴ء) اور ضیا گوک الپ[۱] (۱۸۷۵ء — ۱۹۲۴ء) نے اسلامی ملی تصور کے علی الرغم اس نظریہ کی نشر واشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا[۲]۔ ترک نیشنلزم کی مے اس قدر لنڈھائی گئی کہ عوام اس نشہ سے سرشار ہو کر عربوں اور مسلمانوں سے کٹ کر رہ گئے اب اسی قومیت کی تخم ریزی اسلام دشمن قوتیں کُردوں میں کر رہی ہیں اور انھیں کردستان کی علاحدہ ریاست کی تشکیل وتاسیس کے لیے اخلاقی، نظریاتی اور مادی وجنگی حمایت وتائید

سے نوازرہی ہیں۔ انقرہ کے حکمرانوں کو پھر بھی یہ امید لگی ہوئی ہے کہ مغربی طاقتوں کا رویہ سیکولر ترکی کے مفاد میں اور دہشت گردی کے خلاف ہوگا۔ انھیں اپنی تاریخ کے اسباق بھی یاد نہیں رہے اور موجودہ عالمی سیاسی تناظر بھی ان کی نظروں سے اوجھل معلوم ہوتا ہے۔

دراصل مسئلہ کردستان کے دو پہلو ہیں:

۱۔ ترکی عوام کا وہ طبقہ جو اپنے کو کرد کہلاتے ہیں، مختلف سطح کی محرومیوں اور نابرابری کا شکار رہے اور موجودہ کردستان ورکرز پارٹی (PKK) انہی مظلومیتوں کی پیداوار اور اسی ظلم و نامساوات کا ردِّ عمل ہے۔ اس مسئلہ کو حکومت داخلہ پالیسی میں مناسب اصلاح کرکے حل کرسکتی ہے جس سے ان کی مشکلات تفاہم و تعاون کے ماحول میں دور ہوسکیں۔

۲۔ موجودہ PKK ان انتہا پسند کردوں کی تنظیم ہے جنھیں بیرونی طاقتوں کی حمایت اور امداد حاصل ہے۔ اس تنظیم کی حکمت عملی یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ تشدد اور جارحیت کا ارتکاب کیا جائے جن کے ردعمل میں سیکورٹی فورسز سخت کارروائی کریں اور اس طرح بالواسطہ یا براہِ راست مظلوم طبقہ کی حمایت انھیں حاصل ہوجائے اور دنیا کی نگاہ میں وہ مظلومیت کا پیکر بن کر آجائیں۔

ترکی حکومت نے اول الذکر پہلو پر کبھی توجہ نہ دی اور اس طرح وہ PKK کے بنے ہوئے جال میں پھنستی چلی گئی اور مسئلہ دن بدن زیادہ پیچیدہ ہوتا چلا گیا۔ وزیر اعظم تانسو شلیر (Tansu Ciller) نے خود اس بات کا اعتراف کیا کہ انھیں یہ مسئلہ پہلے اتنا گمبھیر نہ معلوم ہوا تھا اور یہ کہ 'عسکری حل' کے سوا انھیں کوئی راستہ نظر نہیں آتا ہے[۱۵]

حزب الرفاہ کے رہنما پروفیسر نجم الدین اربکان نے ایک بیان میں کہا کہ 'اسلام ہی کرد مسئلہ کا تنہا حل ہوسکتا ہے مگر بدقسمتی سے ترکی دستور نے اسلام کو رفض و بدعت سے زیادہ قابل نفرت بنا دیا ہے' اور اب عسکری و فوجی حل کے سوا کوئی راہ حکمرانوں کو نظر نہیں آرہی ہے چنانچہ صورتِ حال یہ ہے کہ ترکی کی تنظیم حقوق انسانی Turkish Human Rights Association نے ۸۷۴ ایسے گاؤں اور دیہاتوں کی نشاندہی کی ہے جو ۱۹۹۰ء سے اب تک سیکورٹی افواج کے ذریعہ خالی کرائے جاچکے ہیں، سال گزشتہ ۱۹۹۳ء میں ۲۱۰۰ انسانوں کا خون ناحق بہایا جاچکا ہے۔ اس جارحیت نے PKK کی مظلومیت کی داستان چہار دانگ عالم میں پھیلا دی ہے اور ترکی افواج کے بارے میں عوامی تاثر کافی خراب ہوا ہے۔

ایک دلچسپ پہلو اس کا یہ ہے کہ PKK عام طور پر مارکسسٹ۔ اسٹالنسٹ جماعت سمجھی جاتی ہے مگر اس نے بھی مذہب کا سہارا لے کر سیکورٹی افواج کو کافر قرار دیا ہے اور یہ نکتہ نظر ان مظلومین میں عام ہو رہا ہے جو دہشت پسندانہ سرگرمیوں کے خلاف ہونے والی کارروائیوں کا شکار ہوتے ہیں۔

دوسری طرف محترمہ شیلر کی خارجہ پالیسی بھی عجیب تضادات کا شکار ہے۔ وزارت خارجہ کے ایک سکریٹری Ozdem Sanberk نے اصولی انداز میں پہلے حکومت کی خارجہ پالیسی کی وضاحت کی کہ "ترکی کے لیے اسلام اور مسلمانوں کو ترجیح دینا ایک فطری امر ہے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ بہت سی عیسائی اقوام ترکی پر مذہبی جذبہ کے ساتھ نظریں لگائے بیٹھی ہیں۔ ان اقوام کی رعایت بھی ناگزیر ہے ورنہ ترکی اپنا اعتماد و اعتبار کھو بیٹھے گا اور اس کی خارجہ پالیسی کو ترکیت یا اسلام کے دائرہ میں محصور نہیں کیا جا سکتا۔" سینبرک نے یہ بیان استنبول کے Intellectual club کو خطاب کرتے ہوئے دیا۔

اُس وقت کے وزیر خارجہ حکمت سیٹن نے ۱۳-۱۵ نومبر ۱۹۹۳ء کے دورۂ یروشلم کے دوران بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اسرائیل سے دوستانہ تعلقات کی حمایت کی۔ اس حقیقت سے کون آنکھیں بند کر سکتا ہے کہ بیت المقدس پر اسرائیل کا قبضہ غاصبانہ و ظالمانہ ہے اور اقوام متحدہ اور منظمۃ المؤتمر الاسلامی دونوں نے بارہا اس قبضہ کی مذمت کی ہے تاہم ان دونوں مؤقر اداروں کی رکنیت کے باوجود ترکی وزیر خارجہ نے نام نہاد "چمنستانِ امن" میں جا کر شجرکاری کی اور ان کی زبان اُس وقت بھی خاموش رہی جب اسرائیلی وزیر خارجہ شمعون پیریز نے یہ بیان دیا:-

> "یروشلم کی حیثیت پر کسی نقد و تبصرہ کی دعوت دینا اسرائیل کی بہت بڑی غلطی ہوگی۔ آخر ہمیں اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یروشلم ماضی میں اسرائیل کا دار الحکومت رہا ہے اور آج بھی ہے۔" [۳]

وزیر خارجہ اسرائیل کا یہ ردعمل اس سوال کے جواب میں تھا کہ کیا انھوں نے ترکی مہمان کی رائے یروشلم کے بارے میں لی ہے؟ اور ترکی وزیر خارجہ کا اس پر کیا موقف ہے؟ حکمت سیٹن نے شمعون پیریز سے کہا کہ وزیر اعظم شیلر کو اسرائیل آنے کا شوق ہے چنانچہ اس کے جواب میں رابن کی اسی خواہش کا اظہار کیا گیا۔ سیٹن نے ۱۲ دفعات پر مشتمل اسرائیل

سے تہذیبی واقتصادی تفاہم کے معاہدہ پر دستخط کیے اور فتح کے نشہ میں انقرہ واپس آئے۔

جنوری ۱۹۹۴ء میں صدر اسرائیل ایزر وائزمین کا چار روزہ دورۂ ترکی اس کے جواب میں تھا۔ اسرائیل میں متعین ترکی سفیر نے اسے صہیونیوں کے ساتھ تعلقات میں ایک نئے باب کا اضافہ قرار دیا۔ صدر وائزمین نے اپنے دورہ کے تین مقاصد بتائے:

۱۔ عرب اور مسلم ممالک میں ترکی کے ذریعہ معاشی وسیاسی اور عسکری اثر ونفوذ حاصل کرنا۔
۲۔ خطہ کی تعمیر نو میں ترکی حکومت کا تعاون حاصل کرنا۔
۳۔ ترکی سے پانی کی اسرائیلی ضروریات کی تکمیل کرنا۔

وائزمین نے جب شہر Sanilurfa کا دورہ کیا اور وہاں South - East Anatolia Project کا معائنہ کرنے پہونچے تو عوام نے اس کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا اور اپنے سخت غم وغصہ کا اظہار کیا۔ گرچہ ریاستی وزیر نجم الدین سیوہیری نے صفائی پیش کی کہ صدر وائزمین کے دورہ سے ہمارے پروجیکٹ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ تاہم عوام نے ریڈیو اسٹیشنوں پر قبضہ کرکے اپنی برہمی کا اظہار کیا اور اعلان کیا کہ انبیاء کے اس شہر میں وائزمین کی آمد کے ہم خلاف ہیں۔

وائزمین کی میزبانی کے پس پردہ ترکی حکومت چاہتی تھی کہ کردستان ورکرز پارٹی (PKK) کی دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے اسرائیل سے کوئی دفاعی معاہدہ ہو جائے اور مشترکہ دشمن حافظ اسد، جو کرد دہشت گردوں کو پناہ دے رہا ہے، کے خلاف اسرائیل کی حمایت مل جائے لیکن وائزمین نے بڑی عیاری سے ان مسائل سے بے اتفاقی کی۔ اس نے حافظ اسد کو دشمن قرار نہ دیتے ہوئے امن کے قیام میں اس رہنما کے کردار کے امکان کا اظہار کیا اور شامی صدر کو بہادر اور قابل اعتماد فرد بتاتے ہوئے اس سے گفت وشنید کی تجویز ترکی کے سامنے رکھ دی۔ اس نے PKK کو ایک دہشت گرد تنظیم سمجھنے سے انکار کردیا مگر بار بار کے اصرار کے بعد اس نے حکومت کی دلجوئی کے لیے صرف اتنا کہا کہ جن لوگوں کو مسائل کے تئیں مظلومیت کا احساس ہے انھیں دہشت گردی کا سہارا لینے سے پہلے دوبارہ اپنے موقف پر غور کرنا چاہیے۔ کرد ریاست کے تئیں اس کا مبہم جواب یہ تھا کہ "ہم مشرق وسطیٰ میں آزاد فلسطینی ریاست کی وجہ سے سخت مشکلات کا سامنا کررہے ہیں ہم زیادہ سے زیادہ انٹلی جنس کی ٹریننگ اور باہم تبادلہ کا نظم کرسکتے ہیں آپ کو اپنے

دہشت گردوں کے خلاف جنگ خود لڑنا ہوگی۔ یہ کسی ملک کے لیے بہت مشکل ہے کہ دوسرے ملک کی دہشت گردی کے خاتمہ کے لیے وہاں جاکر جسمانی طور سے جنگ میں شریک ہو"۔[۵۹]

ترکی سیاست کا یہ عجیب المیہ ہے کہ وہاں کی حکمراں جماعت اور حزب مخالف سبھی اسرائیل سے سفارتی تعلقات بحال کرنے اور امن و دوستی کے تبادلہ کے حق میں ہیں چنانچہ حزب مخالف ANAP کے رہنما میسوت ایلمازنے بھی صدر وائزمین کو ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا البتہ حزب الرفاہ کا موقف اس معاملہ میں سخت ہے پارٹی کے ڈپٹی چیرمین صبغت کازان نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ "اسرائیل دہشت گردی کا مولد ہے اور اس نے ترکی سرحدوں پر حرص وطمع کی نگاہ جما رکھی ہے"۔[۶۰]

اسرائیل ترکی تعلقات کے علاوہ کردستان کے مسئلہ پر بھی حزب الرفاہ کا موقف بالکل واضح ہے۔ ۴ر اکتوبر ۱۹۹۴ء کو پچاس اراکین امریکی کانگریس نے وزیر اعظم ترکی کو ایک خط میں لکھا کہ انھیں اس امر پر سخت تشویش واضطراب ہے کہ منتخب اراکین پارلیمنٹ کو قومی اسمبلی میں کردوں کے مسئلہ پر اظہار خیال کرنے کے جرم میں موت کی سزا دی جارہی ہے۔ ان امریکی کانگریس اراکین نے ترکی حکومت کو انتباہ دیا کہ اگر کردوں کو سیاسی عمل میں شریک نہ کیا گیا تو کردستان کا مسئلہ حل نہ ہوسکے گا اور دہشت گرد ہر طرح سے مستحکم ہوتے جائیں گے اور ہم جانتے ہیں کہ ترکی حکومت اس بات کو کبھی پسند نہ کرے گی"۔ اسی طرح کے خطوط جرمنی کے اراکین پارلیمنٹ کی جانب سے اور دوسرے یوروپین ممالک کی طرف سے وزیر اعظم کو موصول ہوئے۔

یوروپین یونین کے یہ ممالک کردستان کی علیحدگی پسند تحریک کو ہوا دے رہے ہیں اور کرد جمہوریہ کے قیام کے لیے ترکی حکومت کے اندرونی معاملات میں مداخلت کر رہے ہیں۔ اکتوبر ۱۹۹۴ء میں یوروپین پارلیمنٹری اسمبلی نے ترکی میں حقوق انسانی کی خلاف ورزی پر اپنی رپورٹ شائع کی اور ترکی دستور کی دفعات ۴، ۱۴، ۶۸، ۶۹ اور ۸۴ میں مناسب ترمیم کرنے پر زور دیا تاکہ جمہوریت کے تقاضوں کی تکمیل ہوسکے۔ اس رپورٹ نے ترکی میں اسلام پسند جماعت کی موجودگی کو جمہوریت کے لیے خطرہ قرار دیا۔ مذکورہ بالا دفعات کی ترمیم کی تجویز اس لیے رکھی گئی کہ دفعہ نمبر ۴ اور ۱۴ کا تعلق جمہوریہ کے کردار اور وحدت وسالمیت سے ہے جبکہ دفعہ ۶۸ اور ۶۹ سیاسی حقوق سے اور سیاسی جماعتوں کی تحلیل سے متعلق قواعد وضوابط سے بحث کرتی ہیں اور دفعہ ۸۴ پارلیمنٹ کی رکنیت سے مستعفی ہونے کے بارے میں ہے۔

ترکی کا موجودہ دستور جنرل کنعان اورن کی فوجی حکومت کا تحفہ ہے جسے مغرب کا آشیرواد حاصل تھا۔ ترکی عوام آئین کی بعض غیر جمہوری دفعات کی تبدیلی کے حق میں پہلے سے تھے لیکن یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ عوام کا مقصد و مدّعا اور اسٹارسبرگ میں منعقد یوروپین اسمبلی کا محرک و نصب العین ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متصادم ہیں۔ اگر ترکی عوام آئین میں ترمیم و تنسیخ اور حذف و اضافہ اپنا بنیادی حق تصور کرتے ہیں تو یوروپین اسمبلی بھی اسے اپنا حق سمجھتی ہے کہ ترکی جمہوریت کا وہ ماڈل تیار ہو جو اس کی مرضی اور خواہشات و مفادات کا محافظ ہو چنانچہ اسمبلی کے چیرمین Miguel Angel Martinez نے ترکی کو دھمکی دی ہے کہ اگر مجوّزہ دفعات میں ترمیم نہ کی گئی تو یوروپین اسمبلی کونسل آف یوروپ کی اس کی رکنیت کا جائزہ لے گی اور یوروپ کی وحدت کے دائرہ میں اور اس کے مفاد کو سامنے رکھ کر اقدام کرے گی۔

حزب الرّفاہ کو اس صورت حال کا سخت نوٹس لینا پڑے گا اور اس منظرنامہ کو تبدیل کرنا ہوگا جس میں یوروپین یونین کی رکنیت کی بحالی و برقراری کے لیے سیاسی و تہذیبی سودے بازی کرنی پڑے اور مغرب کی خواہشات و مفادات کی نگراں جمہوریت کی تنفیذ کرکے ترکی ریاست کے تشخص اور وقار کو قربان کرنا پڑے۔ کردستان کے مسئلہ پر پروفیسر نجم الدین اربکان اور ان کی حزب الرّفاہ نے صاف اور دو ٹوک موقف اپنایا ہے۔ پارٹی کے وائس چیرمین عبداللہ گلُ نے مارٹنیز کو جواب میں لکھا کہ :-

Refah supported 'the right of Kurds to preserve their traditions and culture and to speak their own Language as it was during the Ottoman period. No problem was there, because it was a natural human right, but it is an internal issue which can only be solved with an Islamic and fraternal approach and not with a racial mind; ؎

یعنی حزب الرّفاہ نے کُردوں کے اس حق کی حمایت کی ہے کہ وہ اپنی روایات اور ثقافت کا تحفظ کریں اور اپنی زبان میں گفتگو کرسکیں جیسا کہ سلطنت عثمانیہ کے دور میں تھا۔

اُس وقت یہ کوئی مسئلہ نہ تھا کیونکہ یہ ایک فطری انسانی حق سمجھا جاتا تھا۔ تاہم یہ ایک داخلی مسئلہ ہے جو اسلام کی روشنی میں اور برادرانہ جذبات کے ساتھ حل کیا جاسکتا ہے اسے نسلی ذہن کے ساتھ حل نہیں کیا جاسکتا۔

داخلی و خارجی سطحوں پر حزب الرّفاہ کے صریح اسلامی موقف اور مخلصانہ رویّہ کے علاوہ پارٹی کے زیرِ انتظام چلنے والی بلدیات کی ایماندارانہ کارکردگی اور روزمرّہ استعمال ہونے والی اشیاء کی سستی قیمتوں میں فراہمی نے بھی اس کی عوامی مقبولیت میں اضافہ کیا ہے۔ مادّی سیکولر نظام کے پروردہ سیاست دانوں کی اخلاقی گراوٹ، تہذیبی بحران اور ملکی سیاست کے تئیں ان کی افادی روش نے عوام کو ان سے دور کر دیا ہے اور کرپشن اور بدکرداری کے خلاف ان کی نفرت میں اضافہ ہوا ہے۔ دیار بکر بلدیہ کی روزانہ آمدنی پہلے تین ملین ترکی لیرا ہوا کرتی تھی لیکن حزب الرّفاہ کے میئر نے اس شہر کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیا تو اپنی قوت کارکردگی اور امانت و دیانت کی بدولت دو ماہ کے مختصر عرصہ میں اس آمدنی کو پچاس ملین ترکی لیرا تک پہونچا دیا۔ قونیہ میں اس جماعت کے میئر نے اخراجات میں تخفیف کی خاطر ٹیکسی اور عوامی ذرائع نقل و حمل کے استعمال کا التزام کیا اور پرائیوٹ کاروں اور پرتکلف گاڑیوں سے اجتناب کیا جس کی وجہ سے ایک بڑی رقم کی بچت ہوئی جو اب تک ناقابل تصور تھی۔ انقرہ میں اس جماعت نے نظم و انصرام سنبھالتے ہی پانی کی قیمتوں میں پچاس فیصد کی تخفیف کر دی اس وقت انقرہ زمین دوز میٹرو سسٹم کی تشکیل و تعمیر میں مصروف ہے۔ سوشل ڈیموکریٹک پیپلز پارٹی (SHP) کے سابق میئر Murat Karayalcin نے، جو اس وقت ڈپٹی پرائم منسٹر ہیں، ریل کاریں درآمد کی تھیں اور ہر ریل کار کی قیمت ساٹھ بلین ترکی لیرا تھی۔ حزب الرّفاہ کے میئر Melih Gokcek نے اپنے عہدہ کا چارج لیا تو درآمد کا یہ سلسلہ روک دیا اور ترکی ہی میں ان گاڑیوں کی صنعت سازی شروع کی چنانچہ پانچ بلین ترکی لیرا ہی میں انھوں نے اس ریل کار کو تیار کرا لیا۔ اسی طرح حزب الرّفاہ کے زیرِ انتظام بلدیاتی انٹرپرائزمیں بریڈ کے ایک پیکٹ کی قیمت ۲ ہزار ترکی لیرا ہے جبکہ دوسری بلدیات میں یہ پیکٹ سات ہزار لیرے سے کم میں دستیاب نہیں ہے۔

حزب الرّفاہ کے کارکنوں نے مارچ ۱۹۹۴ء کے بلدیاتی انتخابات کے بعد مختلف شہروں کے انتظامات سنبھالے تو اُن پر قرضوں کا زبردست بار تھا کیونکہ سیاست دانوں

کی بدکرداری اور فضول خرچی نے معیشت کو تباہ و برباد کر دیا تھا مثال کے طور پر ارض روم پر ایک ٹریلین لیرے کا قرض تھا، استنبول ۵۲ ٹریلین لیروں کا مقروض تھا اور انقرہ پر ایک سو بیس ٹریلین قرضے کا بوجھ تھا۔ اسی لیے حزب الرفاہ کے مخلص اور باکردار کارکنوں نے صورت حال کا سنجیدہ نوٹس لیا۔ انتظام و انصرام کو قابو میں کیا۔ اسراف اور فضول خرچی پر روک لگائی۔ رشوت ستانی اور بدکرداری پر قدغن لگائی۔ عوامی فنڈ کا غلط استعمال روکا۔ آمدنیوں میں اضافہ کیا اور ملکی صنعتوں کی تشکیل کر کے ایک طرف روزگار کے مواقع فراہم کیے اور دوسری طرف ملک کو خود کفالت اور خود انحصاری کی راہ دکھائی۔ انتخاب سے قبل پارٹی کے خلاف پروپگنڈہ کیا گیا تھا کہ وہ حجاب کی پابندی نہ کرنے والی خواتین کے سر قلم کر دے گی۔ خواتین کے سر وہ کیا قلم کرتی ہاں چور بازاری، رشوت ستانی، عوامی دولت کے بے جا استعمال، قومی معیشت کے ضیاع اور ہر طرح کی ناجائز نفع اندوزی کا سر اس نے ضرور قلم کر دیا[۳۵]

ترکی میں سیاسی بدعنوانی اور اس کے نتیجہ میں حالیہ بلدیاتی انتخابات میں حزب الرفاہ کی کامیابی اور اس کے کارکنوں کی بے لوث خدمات اور عوام میں ان کی روز افزوں مقبولیت کے یہی وہ حالات تھے جب اکتوبر ۱۹۹۴ء میں کویت کے معروف و مقبول عربی ہفت روزہ المجتمع کے نامہ نگار جناب احمد منصور نے پروفیسر نجم الدین اربکان قائد حزب الرفاہ سے ایک طویل انٹرویو لیا۔ نامہ نگار کے سوالات کا جواب محترم اربکان نے اپنی طویل گفتگو میں اس طرح دیا:

پروفیسر نجم الدین اربکان کی توضیحات

سوویت یونین کے سقوط اور اشتراکیت کے زوال کے بعد مغربی دنیا نے نیو ورلڈ آرڈر کا نعرہ دیا اور نئے منصوبوں اور تجاویز کے ساتھ ایک نئے عالمی نظام کی تشکیل کی دعوت دی۔ چونکہ مغربی تہذیب حق و انصاف پر نہیں بلکہ محض قوت و طاقت پر قائم ہے اس لیے اس نئے نظام کے معیارات بھی حق کے بجائے قوت پر انحصار کرتے تھے، آج اس نظام کے ذریعہ مغربی دنیا بقیہ دنیا پر قابض ہونا چاہتی ہے اور اپنی قوت و طاقت کے بل پر اس کی صلاحیتوں کا استحصال کرنے کی آرزو مند ہے اس مقصد کی تکمیل کے لیے وہ اسلام اور مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے نابود کرنا چاہتے ہیں کیونکہ تنہا اسلام ہی وہ نظریۂ حیات ہے جو

ہر حق دار کو اس کا حق دلاتا، ظلم و استبداد کا خاتمہ کرتا اور انھیں انسانوں کی غلامی سے نکال کر خدائے واحد کی بندگی میں داخل کرتا ہے یہاں ہم ایک حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں وہ یہ کہ اسلام ایک آفاقی مذہب اور دین حنیف ہونے کی وجہ سے صرف مسلمانوں کی خوش حالی و کامرانی کو اپنا مقصد قرار نہیں دیتا بلکہ اس کے پیش نظر پوری انسانیت کی فلاح و بہبود ہے اسی لیے ہم انسانیت کی سعادت و خوش حالی کے لیے متحرک ہیں اور پوری دنیا کی بہبود کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس جو اسلامی دستور اور نبوی اخلاق و تعلیمات ہیں وہ خالق کی تعظیم اور مخلوق پر شفقت و محبت کی تلقین کرتی ہیں مگر مغرب میں انتہا پسند صہیونیوں اور عیسائیوں کے ایسے مراکز موجود ہیں جو تمام وسائل و ذرائع کو اختیار کر کے اسلام کے خلاف شعلہ زنی اور مسلمانوں کے خلاف الزام تراشی میں مصروف ہیں غالبًا بیت المقدس ان کی حرص و طمع اور مفاد و منفعت کو دور قدیم ہی سے ظاہر کرتا رہا ہے۔ جہاں یہ ہمیشہ قتل و خوں ریزی کا ارتکاب کرتے رہے ہیں، یہ ان کی تاریخ کو نمایاں کرنے والی ایک بہترین مثال ہے۔ بوسنیا اور ہرسک، کشمیر اور فلسطین اور آذربائیجان وغیرہ دنیا کے مختلف حصوں میں ان کے جرائم ان کی اس ذہنیت پر شاہد ہیں۔ ناٹو کی حلیف طاقتیں پہلے اپنی فوجی چالوں میں دشمن سوویت یونین کی طرف اشارہ کرنے کے لیے سرخ علم کا استعمال کرتی تھیں مگر اب نئے دشمن (مسلمانوں) کی علامت ان کے نزدیک سبز علم بن چکی ہے۔

مغرب کی ان ظالمانہ کارروائیوں اور اسلام اور عالم اسلام کے خلاف ان کی عداوتوں اور سازشوں کے عوامل ایسے ہیں جنھوں نے اسلامی بیداری کی تخم ریزی میں اور اس کی افزائش و ارتقا میں اہم کردار ادا کیا ہے اور اس کی بہترین مثال ترکی میں اور عالم اسلام میں اسلامی نشأۃ ثانیہ کی تحریک ہے۔ یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ ترکی ۱۹۴۶ء سے متعدد سیاسی جماعتوں کی رزم گاہ رہا ہے جس میں اگر کوئی انقطاع ہوا ہے تو فوجی انقلاب کی وجہ سے۔ مغرب نواز حکومتیں تقریبًا پچاس سالوں سے تشکیل پاتی رہی ہیں لیکن ترکی میں اور عالم اسلام میں پچھلے جو واقعات رونما ہوئے ان سے مغربی اقوام کے ناجائز مفادات کھل کر سامنے آ گئے ترکی قوم نیند سے بیدار ہوئی اور آج ترکی میں کسی بڑی تبدیلی کی آس لگائے بیٹھی ہے جس طرح سوویت یونین کے سقوط سے بڑا انقلاب رونما ہوا اور ظلم و استبداد کی طویل رات رخصت ہوئی۔ آج ترکی قوم کو یہ احساس ہو گیا ہے کہ تقلید مغرب پر استوار ترکی نظام روبہ زوال

ہے اور یہ حقیقت پچھلے تین انتخابات کے نتائج سے ظاہر ہے۔

نومبر ۱۹۹۲ء کے ۲۳ بلدیاتی حلقاتِ انتخابات میں انتخاب کنندگان کی تعداد ایک ملین سے زائد تھی۔ اِن انتخابات میں حزب الرفاہ نے ۲۵ فیصد ووٹ حاصل کیے تنہا استنبول میں اسے ۲۸ فیصد ووٹوں کی فتح نصیب ہوئی جبکہ حزب حکمران کو ۱۴ فیصد سے زیادہ ووٹ نہ مل سکے۔ ۲۷ر مارچ ۱۹۹۴ء کے انتخابات میں جبکہ پورے ترکی میں الیکشن ہوئے، سیکولر جماعتوں کے مقابلہ میں حزبُ الرّفاہ کو بھاری کامیابی ملی۔ تمام بڑے بلدیات جیسے استنبول، انقرہ، قونیہ، سیواس، ارض روم، دیار بکر اور مرعش میں اور تمام اساسی مراکز میں اس کے نمائندے کامیاب ہوئے۔ بڑی اہم جماعتوں نے مل کر جتنے بلدیات پر قبضہ کیا ان سے زیادہ تنہا حزب الرّفاہ کے قبضہ میں آئیں۔ چنانچہ چھوٹی بڑی ملا کر تقریباً سات سو بلدیات ہیں جن میں سے چار سو بلدیات پر حزب الرّفاہ کا قبضہ رہا۔ یہ دیکھ کر غیر اسلامی قوتوں میں کھلبلی مچ گئی اور مختلف طریقوں سے بعض بلدیات کے نتائج انھوں نے منسوخ کرادیئے۔ چنانچہ ۳ر اور ۱۰ر جولائی کو ان میں ازسر نو انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات میں حزب الرفاہ کو ۴۷ فیصد ووٹ ملے جبکہ حکمران جماعت کو صرف ۱۲ فیصد ووٹوں کی برتری ملی اور اسی قدر مدرلینڈ پارٹی کو بھی ووٹ ملے حکومت میں شریک بائیں بازو کی جماعت کو صرف ۵ فیصد ووٹ ملے۔ اس طرح ووٹوں کا مجموعی تناسب ۲۷ فیصد رفاہ کے حق میں اور تینوں بڑی جماعتوں کے حق میں ۲۹ فیصد کا رہا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ترکی کے ہر دو اشخاص میں سے ایک شخص حزب الرّفاہ کی حمایت کر رہا ہے اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ ۶۲ ملین سے زائد ترکی مسلمان شوق اور دلچسپی کے ساتھ حزبُ الرفَاہ کے اقتدار میں پہنچنے کے منتظر ہیں۔

بلدیات میں حزبُ الرّفاہ کی خدمات

انتخاب میں فتحیاب ہونے کے بعد جن بلدیات پر رفاہ پارٹی کا قبضہ ہوا، وہاں کیا منصوبے اور پروگرام بروئے کار لائے گئے اور اس سلسلہ میں ذمہ داران کو کتنی کامیابی ملی اور کن مشکلات و مسائل کا انھیں سامنا کرنا پڑا، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر نجم الدین اربکان کہتے ہیں:۔

ہم نے جب پچھلے پانچ مہینوں میں حزب الرّفاہ کے زیر انتظام چلنے والی بلدیات کا جائزہ لیا تو ہم نے دیکھا کہ رفاہ کے ذمہ داران نے اس مختصر عرصہ میں بڑے بڑے منصوبوں کو مکمل کر لیا جنھیں دیکھ کر ترکی قوم عش عش کر اٹھی۔ اس قومی مسرت و تعظیم کے چار بڑے اسباب ہیں:

۱۔ حزب الرّفاہ ہی اس قوم کے عقیدہ کی نمائندہ جماعت ہے۔

۲۔ ہماری جماعت اس قوم کی قدیم تاریخ اور درخشندہ تہذیب کی نمائندگی کر رہی ہے۔

۳۔ اِن بلدیات کے ذمہ داران شب و روز کی مخلصانہ جدوجہد میں مصروف ہیں جس کا مشاہدہ اس قوم کا ہر فرد کر رہا ہے۔

۴۔ منفعت بخش تمام پروگراموں میں ترکی عوام کو شریک کیا جاتا ہے۔

مغرب نواز سیکولر جماعتوں کا رویہ اس کے برعکس رہا ہے۔ وہ متضاد صفات سے پہچانی جاتی رہی ہیں:

۱۔ انھوں نے ترکی قوم کے عقیدہ کے خلاف محاذ آرائی کی۔

۲۔ اس ملک کی قدیم تاریخ و تہذیب کے استیصال میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔

۳۔ انھوں نے اپنے نجی مفادات کا تحفظ کیا اور فوری مصالح پر ملک کے مستقبل کو قربان کیا۔

۴۔ ترکی قوم کے ساتھ ان کا معاملہ تفوّق و تغلّب کا رہا ہے اور کسی منصوبہ میں عوام کو انھوں نے شریک نہ کیا۔

انہی اسباب کی وجہ سے پانچ ماہ کے مختصر عرصہ میں ان بلدیات کی ہر چیز بدل کر رہ گئی۔ ان کی آمدنی میں کم از کم دس گنا اضافہ ہوا۔ اخراجات پر روک لگائی گئی اور عوامی دولت کے غلط استعمال کا سختی سے محاسبہ کیا گیا جو پچھلی حکومتوں کے لیے ناقابل تصور اور ناممکن العمل تھا۔ اگر ہم حزب الرفاہ کے زیر انتظام چلنے والی بلدیات کی کارکردگی کا احاطہ کرنا چاہیں تو بڑی مشکل پیش آئے گی کیونکہ اس کے لیے متعدد جلدیں درکار ہوں گی۔ معاملہ کی وضاحت کے لیے میں ان پروگراموں اور خدمات میں سے بعض کے کچھ عمومی خاکوں کی تشریح کروں گا۔

مثال کے طور پر بلدیہ انقرہ میں تقریباً بارہ سو بسیں چلتی ہیں لیکن ماضی میں ان سے آمدنی کے بجائے خسارہ ہی ہوتا رہا ہے۔ سال گزشتہ اس خسارہ کی رقم ایک ٹریلین

ترکی لیرے تک پہونچ گئی۔ حزب الرّفاہ نے بس کمپنیوں میں جاری لوٹ کھسوٹ اور کرپشن کا سدّباب کیا اور پانچ ہی مہینوں میں حالات کو اپنے قابو میں کرکے خسارہ کے بجائے نفع بخشی تک پہونچایا۔ پچھلے سالوں میں اسی بلدیہ پر تین بلین ڈالر کا قرض تھا گویا آمدنی کے بجائے اخراجات ہی کا تسلسل رہا۔ اس کے بعد پروفیسر اربکان نے ریل کاروں کی درآمد اور اس کے اخراجات کی تفصیل بیان کی جو اوپر آچکی ہے۔

استنبول میں پانی کی فراہمی کا مسئلہ

دوسری مثال پروفیسر اربکان نے استنبول میں پانی کی دقت اور اس کے اخراجات کی دی۔ بلدیہ کے سابق ذمہ داروں نے اس مسئلہ پر ایک فرانسیسی کمپنی سے معاہدہ کیا تھا اور صرف مشورہ کی قیمت دس ملین ڈالر چکائی تھی۔ آٹھ ماہ گزر گئے مگر کمپنی کی کوئی کارکردگی سامنے نہ آئی۔ جب حزب الرّفاہ نے انتخاب جیتا تو اس معاہدہ کو کالعدم کردیا اور اس سلسلہ میں قومی آمدنی میں جو خرد برد ہوئی تھی اور ایک بنیادی ضرورت کی تکمیل کے پس پردہ نفع اندوزی کی جو ذہنیت کارفرما تھی اس کو طشت از بام کرنے کے بعد چند مہینوں میں کم تر اخراجات میں مسئلہ کے ایک بڑے حصّہ کو حل کیا۔

اسی طرح بلدیہ کی صفائی اور کوڑے اور غلاظت کی تطہیر کا مسئلہ خاصا سنگین رہا ہے۔ استنبول میں بارہ ملین سے زیادہ آبادی ہے جس کی صفائی پر کافی اخراجات آتے رہے ہیں۔ حزب الرفاہ نے کافی غور وخوض اور بحث ومطالعہ کے بعد ایک کارخانہ کی تاسیس کا فیصلہ کیا جس میں کوڑے کو کسی مفید کام میں استعمال کیا جاسکے۔ اس منصوبہ پر جو لاگت آئے گی وہ اُن اخراجات کے پانچویں حصّہ سے بھی کم ہوگی جو معاہدوں کے تحت اس کے لیے مامور مغربی کمپنیوں کو ادا کرنا پڑتے ہیں۔

بنیادی ضروریات کی ضمانت

پروفیسر اربکان مزید کہتے ہیں کہ اشتراکیت اور سرمایہ داری میں سے کسی نظام نے انسانی خوشحالی اور فلاح وسعادت کی ضمانت فراہم نہیں کی لیکن حزب الرفاہ جو عادلانہ نظام کی علمبردار ہے، اس نے میسّر قانونی دفعات اور امکانات ووسائل کے مطابق بلدیاتی

اداروں کے ذریعہ نظامِ عدل کی متعدد اساسیات کی تنفیذ میں کامیابی حاصل کی۔ آج صورت حال یہ ہے کہ روٹی، گوشت اور سبزیوں کی وافر مقدار میں فراہمی پوری ترکی قوم کے لیے ہو رہی ہے اور تاجر حضرات نے ان بنیادی اشیاء کی جو قیمت مقرر کر رکھی ہے اس سے ایک تہائی کم قیمت میں رفاہ کی بلدیات اشیائے خوردنی فراہم کر رہی ہیں۔ دوسری بلدیات میں روٹیوں کی قیمت چھ ہزار ترکی لیرا ہے جبکہ حزب الرفاہ نے ان کی قیمت صرف دو ہزار لیرا رکھی ہے گوشت اور سبزیاں تاجروں کی قیمت سے نصف کی شرح پر رفاہ کی دوکانوں پر فروخت ہو رہی ہیں۔ بعض منصوبے رفاہ نے نافذ کر دیئے ہیں اور بعض ابھی تنفیذ کے مراحل میں ہیں ترکی قوم ان تمام حقائق کا مشاہدہ کر رہی ہے اور ان کی تفصیل میں جانے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ ان منصوبوں کی تنظیم و تنفیذ سے پارٹی کی عوامی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے اور رائے عامہ کی تشکیل میں اور ذیلی انتخابات میں کافی فرق واقع ہوا ہے۔

افضل ترین بلدیہ

جاپان نے پچھلے دنوں دنیا کی تمام بلدیات کا جائزہ لیا اور تنظیم حکومت اور خدمت معاشرہ کے نقطۂ نظر سے قونیہ کی بلدیہ کو افضل ترین قرار دیا۔ قونیہ کی بلدیہ کا انتظام حزب الرفاہ کے ایک ذمہ دار ڈاکٹر خلیل قرن کی سربراہی میں پچھلے کئی برسوں سے نہایت منظم انداز میں کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ صدر بلدیہ نے جاپان کی راجدھانی ٹوکیو کا سفر کیا اور اس عظیم الشان خدمت کا ایوارڈ حاصل کیا۔ یہ حزب الرفاہ کی شاندار کارکردگی کا عالمی اعتراف تھا۔

بلدیات کے تئیں حکومت کا موقف

ترکی حکومت سابقہ بلدیات کے ساتھ کافی تعاون کرتی رہی ہے۔ قرضوں کی ادائگی میں تخفیف اور مزید قرضوں کی فراہمی کر کے بلدیاتی اداروں کے ساتھ حسن ارتباط کا ثبوت دیتی رہی ہے لیکن حزبُ الرفاہ کو حکمراں جماعت نے اپنا مدِمقابل سمجھ کر اس کے ساتھ سوتیلے پن کا سلوک کیا ہے اور حکومت نے اسے تنگ کرنے کی مختلف چالیں چلی ہیں تاکہ رفاہ کے کارکنوں کی صلاحیت پر سے عوام کا اعتماد اٹھ جائے۔ چنانچہ بلدیات کے ذرائع آمدنی ختم کر کے، صدور بلدیات کی کارکردگی کی تنقیص کر کے ان کا عوامی اعتماد ختم کرنے کی

سازش کی گئی ہے۔ دوسری سیاسی جماعتوں کے صدور بلدیات کے دور میں جو قرضے ہو گئے تھے انھیں جلد از جلد چکانے پر زور دیا گیا اس سلسلہ میں حکومت نے نئے قوانین وضع کیے تاکہ رفاہ کے ذمہ داران پچھلے قرضوں کی ادائیگی میں الجھے رہیں اس قسم کے قوانین بھی بنائے گئے کہ قرضوں کی عدم ادائیگی کی صورت میں بلدیات کی جائیدادیں ضبط کر لی جائیں گی حتیٰ کہ صدر بلدیہ کے گھر پر قبضہ کر لیا جائے گا۔ اس صورتِ حال نے رفاہ کے زیرِ انتظام بلدیات کی زندگی مفلوج کر دی ہے اور بھاری قرضوں کی ادائیگی اور ناکردہ گناہوں کی سزا نے انھیں سخت مشکل میں ڈال رکھا ہے حالانکہ اس ابتر معاشی صورتِ حال کی ذمہ داری صرف مغرب نواز سابق بلدیات کے صدور کی ٹھہرتی ہے۔

سابقہ بلدیات کے قرضے

پروفیسر اربکان نے ترکی حکومت پر قرضوں کے بوجھ کی تفصیل بتاتے ہوئے فرمایا کہ مغرب نواز حکومتوں نے پچھلے پچاس سالوں میں ملک کو قرضوں کے انبار سے بوجھل بنا دیا ہے اور قومی معیشت کی کمر ٹوٹ گئی ہے۔ اقتصادیات ان کے ہاتھوں تباہ ہو چکی ہے اور ملک قرضوں کے بوجھ سے کراہ رہا ہے۔ بیرونی ممالک کا ترکی پر اس وقت ۱۰۰ بلین ڈالر قرض ہے جس کا سود ہر سال ۵،۸ بلین ڈالر بڑھتا جا رہا ہے۔ اندرونی قرضے ۲۰ بلین ڈالر تک پہونچ چکے ہیں اور سود کی شرح اس قدر تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ ترکی لیرے کی قیمت کے مطابق ۸۰ سے ۹۰ فیصد ہو گئی ہے اور اس طرح داخلی اور خارجی قرضوں پر سود کی شرح ۲۰ بلین ڈالر سالانہ تک پہونچ چکی ہے جبکہ ٹیکس کے سخت اور بے رحم نظام سے حاصل ہونے والی سالانہ آمدنی ۱۸ بلین ڈالر سے زیادہ نہیں ہو پاتی اس طرح حکومت کی ٹیکس سے حاصل شدہ آمدنی قرضوں کے سود کی ادائیگی کے لیے بھی کافی نہیں ہوتی۔

قرضوں کی یہ صورتِ حال ہمارے سامنے ایک اہم سوال پیش کرتی ہے وہ یہ کہ یہ مغرب کی غلام حکومتیں حکومت کے دفاتر اور ان کی تزئین و آرائش پر اس قدر زرِ کثیر کیوں صرف کرتی ہیں؟ وہ اپنے اداروں اور اوضاع کے تحفظ کے لیے مغرب کے سامنے کاسۂ گدائی پھیلاتی ہیں اور انھیں اس بات کی فکر نہیں ہوتی کہ ملک کا انجام کیا ہوگا۔ وہ کرنسیاں ڈھالتی چلی جاتی ہیں اور ترکی حکومت کی اقتصادیات روز بروز ابتر ہوتی جاتی ہے اور کرنسی

کی قدر گھٹتی جاتی ہے۔

مغرب کی رفاہ سے خوف زدگی

مغرب کی غلامی میں گرفتار یہ حکومتیں قرضوں اور مالی تعاون کی بھیک مانگنے امریکہ اور یورپ پہونچتی ہیں اور وہاں کے قائدین اور عوام کو حزب الرفاہ سے خوف زدہ کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ پروفیسر اربکان نے اس کی ایک حالیہ مثال بیان کی۔ وزیر اعظم ترکی نے اپنے آخری دورۂ امریکہ میں وہاں کے ذمہ داروں سے فرمایا کہ "آپ ہمیں مالی امداد دینے اور قرض فراہم کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ آپ کو معلوم ہے کہ بصورت دیگر حزبُ الرفاہ تاک میں لگی ہوئی ہے۔ اگر ہم اپنے فرائض کی ادائیگی میں ناکام رہے تو رفاہ پارٹی کی اقتدار تک رسائی ہو جائے گی اور ترکی میں اس جماعت کے برسر اقتدار آنے کا مفہوم آپ اچھی طرح سمجھتے ہیں پھر تو ترکی کی مسلمان فوج ویانا کی فصیلوں اور پیرس کے دروازوں پر دستک دے رہی ہوگی"۔ اس طرح مغرب کو ہم سے خوف زدہ کیا جارہا ہے۔

محترمہ تانسو شیلر نے اپنے آخری دورۂ فرانس میں اسٹراٹیجک اسٹڈیز انسٹی ٹیوٹ میں لیکچر دیا جس میں ارکین پارلیمنٹ اور سیاسی ماہرین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ لیکچر کے اختتام پر کسی شخص نے سوال کیا کہ آپ کا کہنا ہے کہ فرانس نے اگر ہمیں مالی امداد نہ دی تو حزبُ الرّفاہ ترکی میں برسر اقتدار آجائے گی۔ بالفرض اگر ایسا ہو جائے تو کیا ترکی فوج رفاہ کے خلاف انقلاب کا پرچم نہیں سنبھال لے گی جیسا کہ الجزائر میں اسلام پسندوں کے خلاف ہو چکا ہے؟

محترمہ وزیر اعظم نے اس کے جواب میں فرمایا کہ ترکی فوج ایک بنیادی اور اہم سبب کی بنا پر ایسا نہیں کرے گی وہ یہ کہ ترکی کے حالات الجزائر کے حالات سے مختلف ہیں اور ترکی فوج جمہوریت کی حمایت وتائید کرتی ہے اس کی مخالفت نہیں کرتی۔ ترکی میں جب بھی فوج نے اقتدار سنبھالا، حالات قابو میں آتے ہی وہ اپنے بیرکوں میں واپس چلی گئی اور سیاسی امور کو قومی نمائندوں کے حوالہ کر دیا۔ محترمہ شیلر کو فرانسیسی ماہرین سیاست سے گفتگو کرتے ہوئے متعدد اہم حقائق کا ادراک تھا:۔

ان کے پیش نظر پہلی حقیقت یہ تھی کہ ترکی میں جن فوجی کمانڈروں نے اقتدار پر

قبضہ کیا، انقلاب کے اختتام پر عوام کے اندر سے ان کی ہیبت ختم ہوگئی اور اُن کے تئیں عزت وعقیدت کے جذبات کافور ہوگئے اور ترکی عوام کے اندر وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ رہ سکے اس کی نمایاں مثال یہ ہے کہ ۱۹۶۰ء میں جو فوجی انقلاب آیا اس کے سربراہوں کی زندگی بعد میں اجیرن ہو گئی اور قاضی سالم پاشا جس نے عدنان مندریس کو پھانسی کی سزا دلوائی تھی، عوام کے غیظ وغضب اور نفرت کا نشانہ بنے بغیر نہ رہ سکا اور سڑکوں پر چلنا اس کے لیے دوبھر ہو گیا۔ چنانچہ فوجی سربراہوں کو اس مسئلہ کی سنگینی اور اثرات کا پورا احساس ہے۔

محترمہ شیلر کو جس دوسری حقیقت کا اچھی طرح ادراک ہے وہ یہ ہے کہ ۲۷ مارچ کے گزشتہ بلدیاتی انتخابات میں عجیب وغریب نتائج کا ظہور ہوا وہ علاقے اور شہر جہاں فوجی افسران کی رہائش تھی ان میں حزب الرفاہ کے نمائندے کامیاب ہوئے مثال کے طور پر دلجک، کوجیالیک، جیزہ کے شہروں نے جہاں بحریہ کے افسران بڑی تعداد میں رہتے ہیں، ہمارے نمائندوں کو کامیاب کیا۔ ان انتخابی حلقوں میں رفاہ کے کارکنوں کو اعلیٰ ترین تناسب میں حمایت اور تائید ملی۔ اسی طرح قونیہ، سنجان اور انقرہ کے علاقوں میں جہاں فضائی فوج کا عملہ رہائش پذیر ہے۔ حزب الرفاہ کو بڑے پیمانہ پر ووٹ ملے۔ استنبول، توزلا، سمندرہ اور کارٹال کے خطے جہاں برّی فوج کے کارکنان رہتے ہیں، رفاہ پارٹی کی فتح وکامرانی کے حلقے ثابت ہوئے۔

ان تمام حقائق کے پیش نظر، جن کا محترمہ شیلرا ور سیاسی مشاہدین کو اچھی طرح احساس واعتراف ہے، یہ اشارہ ملتا ہے کہ ترکی فوج کو ملک کے مفاد کے سوا کوئی چیز عزیز نہیں ہے اور وہ حریت وجمہوریت کا احترام کرتی ہے کہ اسی سے ملک کی خوش حالی اور سالمیت وابستہ ہے۔ ترکی فوج کو ملک کے استیصال میں شریک کرنا یا قوم کے خلاف اسے تیار کرنا، جیسا کہ تیسری دنیا کے متعدد ملکوں میں ہو رہا ہے، بڑے خسارہ کا سودا ہوگا کیونکہ ترکی کا اپنا ہیکل اور تشخص ہے۔ اسی لیے ترکی فوج حزب الرفاہ کے برسراقتدار آنے سے دلچسپی رکھتی ہے اور مسلمان ترک عوام بھی اسی دن کے منتظر ہیں اور خود مغربی رہنماؤں کو بھی اسی کا انتظار ہے[۱۰]

پروفیسر نجم الدین اربکان کے اس طویل انٹرویو سے جہاں ترکی سیاست کے

موجودہ نشیب وفراز اور حزب الرفاہ کی خدمات اور کارناموں پر روشنی پڑتی ہے وہیں ترکی عوام کے اندر ابھرنے والی اسلامی بیداری کے واضح آثار کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس سے اس امر کی نشاندہی بھی ہوتی ہے کہ ترکی میں اسلام پسند رہنماؤں نے اعتدال، توازن اور معقولیت ودور اندیشی کا ثبوت مہیا کیا ہے اور وہ حکمت وفراست کے ساتھ اسلامی نشأۃ ثانیہ کی راہ ہموار کرنے میں مصروف ہیں۔

تعلیقات وحواشی

سلہ ضیاء گوک الپ ترکی کا ایک قوم پرست مفکر ورہنما تھا۔ ولادت دیار بکر میں ہوئی۔ ادب وریاضی سے خصوصی دلچسپی لینے کے علاوہ اسکول ہی کے زمانہ تعلیم میں اس نے فرنچ اور مشرقی علوم کا حصول اپنی زندگی کا مقصد بنایا اپنے فاضل چچا کی مدد سے اس نے مفکرین اسلام کا مطالعہ کیا اور دوسری طرف نامق کمال، ضیاء پاشا اور احمد مدحت آفندی وغیرہ کے مضامین کا مطالعہ بھی کیا۔ ۱۸۹۶ء میں وہ قسطنطنیہ گیا تاکہ مزید تعلیم حاصل کرے مگر وہ تعلیم سے زیادہ سیاست سے دلچسپی رکھتا تھا اسی لیے انجمن اتحاد وترقی کا رکن بن گیا۔ اس کی بعض باغیانہ تحریروں کی وجہ سے وہ کالج سے نکال دیا گیا اور دیوار زنداں کے پیچھے ڈھکیل دیا گیا۔ ۱۹۰۹ء میں سلطان عبدالحمید خاں کی معزولی کے بعد اسے آزادی سے کام کرنے کا موقع ملا اور سلونیکا میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد وہ ایک قوم پرست لیڈر بن گیا اور ترکی قومیت کی اتحاد وتنظیم کی دعوت دینے لگا۔ ۱۹۱۵ء میں وہ علوم عمرانیہ کا استاد استنبول یونیورسٹی میں مقرر ہوا۔ ۱۹۲۲ء میں مصطفیٰ کمال نے اسے ہیئت تالیف وترجمہ کا صدر نامزد کیا اور اسی سال ترکی پارلیمنٹ کا رکن بھی منتخب ہوا۔ ۱۹۲۴ء میں ۴۸ یا ۴۹ سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوا۔ اس نے اپنی تصنیف Turkish Nationalism and Western Civilization میں مغربی تہذیب کو اختیار کرنے کی دعوت اس لیے دی کہ وہ دراصل قدیم تمدن کے تسلسل کی ایک شکل ہے جس کی نشو ونما میں ترکوں کا خاص حصہ رہا ہے۔

سلہ یہ بات باعث حیرت ہے کہ مغربی اور یورپی سامراج کے پروپیگنڈہ سے متاثر ہوکر عرب محققین اور ادباء وشعراء بھی سلطان عثمانی کے خلاف الزامات وہفوات کی ترویج میں شریک ہوگئے اور نام نہاد ترک قومیت کے خلاف ردعمل کے طور پر عرب قومیت کا ملحدانہ نعرہ دیا۔ مصری ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کی ایک بڑی تعداد اس خلاف اسلام نظریہ کا شکار ہوگئی اور آج جدید عربی ادب کا بڑا حصہ =

ان زہریلے اور قاتل اثرات سے مسموم ہے۔

۳ۃ امپیکٹ انٹرنیشنل، جلد ۲۴، شمارہ ۳، مارچ ۱۹۹۴ء ص ۱۱

۴ۃ وائزمین نے برجستہ کہا:

"It would be a great mistake for Israel to invite comments on the status of Jerusalem. Why should we do that? Jerusalem was and is the eternal capital of Israel."

۵ۃ جولائی ۱۹۹۳ء میں مملکت اسرائیل کے ایک مشیر نے ترکوں کو مشورہ دیا کہ کُرد دہشت گردی میں ایران اور شام کے علاوہ یونان بھی ملوث ہے اس لیے اس PKK کی کارروائیوں کے پس پردہ ایتھنز پر بھی نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ یونانی کردستان کے مسئلہ کو بین الاقوامی فورموں میں متعارف اور منظور کرا سکتے ہیں۔ ایک طرف یہودیوں نے انقرہ اور ایتھنز کے کشیدہ تعلقات میں مزید بدمزگی پیدا کر کے ترکی کو الجھانے کی کوشش کی اور دوسری طرف حکمت سیٹن کی واپسی کے معًا بعد یونان۔ قبرص وزیر خارجہ الکوس میخائیلیدیز تل ابیب پہونچ گیا تاکہ اقتصادیات، سیاحت اور ثقافت کے میدانوں میں ایتھنز اور تل ابیب کے درمیان تعاون و اشتراک کی راہیں نکالی جاسکیں۔ یہودیوں کی اس دوہری حکمت عملی اور منافقانہ سیاست کے باوجود ترکی حکمراں اُن سے خیر کی توقع لگائے بیٹھے ہیں۔ ع

سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

۶ۃ امپیکٹ انٹرنیشنل، حوالہ بالا، ص ۱۲

۷ۃ امپیکٹ انٹرنیشنل، نومبر ۱۹۹۴ء ص ۹

۸ۃ نفس مصدر، ص ۸

۹ۃ ۲۷ مارچ ۱۹۹۴ء کے بلدیاتی انتخاب میں حزب الرّفاہ کو ۱۹ فیصد، ٹروُ پاتھ پارٹی (DYP) کو ۲۴،۹۴ فیصد اور مدر لینڈ پارٹی (ANAP) کو ۲۱،۲ فیصد ووٹ ملے۔ انتخاب کے ان نتائج کو 'رفاہ زلزلہ' (Refah Quake) سے تعبیر کیا گیا کیونکہ سابق ریکارڈ کے مقابلہ میں حزب الرفاہ کی یہ کامیابی بہت حوصلہ افزا تھی۔

۱۰ۃ المجتمع کویت، شمارہ ۱۱۱۹، ۲۸ ربیع الآخر ۱۴۱۵ھ / ۴ اکتوبر ۱۹۹۴ء ص ۲۲ - ۲۵

ترجمہ وتلخیص

اعضاء کی پیوندکاری

ایک نقطۂ نظر

انگریزی سے ترجمہ: ڈاکٹر منور حسین فلاحی

زیر نظر مسئلہ پر شروع سے علماء کی دو رائیں ہیں ایک رائے اس کے مطلق جواز کے حق میں ہے دوسری اس کے برعکس، اس تحریر میں صرف ایک رائے کی نمائندگی ہوئی ہے، اور مخالف رائے کے دلائل اور اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ مضمون کے بنیادی مباحث شیخ مناع القطان کی کتاب فقہی اجتہاد سے ماخوذ ہیں جبکہ اعتراضات اور ان کے جائزہ والا حصہ دی مسلم ریڈر ج ۵ ش ۲ سے لیا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ دوسرے پہلو پر بھی مدلل انداز سے باتیں سامنے آئیں ——— (مترجم)

اسلامی فقہ انسانی مفادات کا فروغ چاہتی ہے۔ اگر قرآن مجید اور حدیث نبوی زندگی کے کسی مسئلہ میں کوئی واضح رہنمائی نہیں کرتے تو فقہاء اس بات کے مکلف ہیں کہ انسانوں کے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے اور شرعی اصولوں کی رہنمائی میں اس کا کوئی حل تلاش کریں۔ اس طریقہ سے کیا گیا فیصلہ ہی بہتر فیصلہ تصور کیا جائے گا۔

کسی مسئلہ کے سلسلہ میں قانونی فیصلہ دیتے وقت درج ذیل اصولوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

ممنوع چیزیں بھی ضرورت کے وقت مباح ہوجاتی ہیں۔

مضرت رساں تکلیف کا ازالہ ہونا چاہیے۔

حاجت کو بھی ضرورت کے مثل سمجھا جائے۔

نقصان کا ازالہ، فائدہ کے حصول پر ترجیح رکھتا ہے۔

اگر دو فائدوں میں ٹکراؤ کی صورت ہو تو بڑے فائدے کو ترجیح حاصل ہوگی۔ آسانی اور دشواری کے درمیان ٹکراؤ ہونے کی صورت میں جس کی طرف اصول شریعت کا رجحان غالب ہوگا اسی کو اختیار کیا جائے گا۔

اجتہادی نقطۂ نظر سے یہ ضروری ہے کہ مندرجہ بالا اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے ایثار و تعاون کے اسلامی تصورات کی وضاحت کے ساتھ ساتھ موجودہ دور کی تمام ترترقیوں اور امکانات کو قانون سازی کے وقت سامنے رکھا جائے۔

اسلامی شریعت کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ ہر زمانہ کے انسانی تقاضوں اور ضرورتوں کی تکمیل کر سکے اس لیے کسی بھی پیش آمدہ مسئلہ میں درج بالا اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے اجتہاد کرنا چاہیے۔ اس طرح کوئی ایسا مسئلہ جو زندگی کے کسی پہلو سے متعلق ہو اور نئے حالات اور تقاضوں کی روشنی میں اس میں تفصیلی غور و خوض کی ضرورت ہو تو اس پر از سر نو غور و فکر کیا جائے۔ عہد حاضر کی ایجادات، انکشافات اور ترقیات کے سلسلہ میں بھی اسلامی نقطۂ نظر کو پیش کرنے کی ضرورت ہے اور یہ کام بغیر اجتہاد کے انجام نہیں پا سکتا۔ اسی طرح بعض مسائل میں جس قدر تفصیلی غور و خوض کی ضرورت آج پیش آئی ہے پہلے نہیں تھی ان پر مطلوبہ انداز میں غور و فکر ہونا چاہیے۔

طبی دنیا میں جو ترقیاں ہوئی ہیں ان پر اسلامی نقطۂ نظر سے غور و فکر کے لیے درج ذیل امور قابل توجہ ہیں۔

بقائے نفس

اسلامی فقہ میں بقائے نفس کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ مریض کے علاج کے لیے یا انسانی زندگی کی بقا کے لیے موجودہ سائنسی و طبی وسائل و ذرائع کو اختیار کرنا جائز ہے لیکن اسلامی فقہ کے جو لازمی مقاصد ہیں ان کا تحفظ اور ان کی رعایت بہر حال ضروری ہے۔

لاش کی چیر پھاڑ

بعض مخصوص حالات میں مُردے کی چیر پھاڑ جائز ہے اور بعض حالات میں ضروری ہے مثال کے طور پر ڈاکٹر اور سرجن کی تیاری اور تربیت ایک قومی ضرورت ہے اس ضرورت کے لیے یہ عمل فرضِ کفایہ قرار پاتا ہے کیونکہ یہ طبی عمل کا ایک ناگزیر جزء ہے اس طرح حادثاتی اموات کے اسباب کا پتہ چلانے کے لیے بھی پوسٹ مارٹم کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ لوگوں کے درمیان انصاف قائم کیا جا سکے۔

پوسٹ مارٹم اور اس طرح کے دوسرے آپریشن کسی جائز فائدے کے حصول کے لیے ہی ہوتے ہیں۔ ایسا کرتے وقت ضرورت کی سطح اور فائدہ کی کیفیت کے لحاظ سے ہی اس کے درست ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے ۔ اس سلسلہ میں صرف لاش کی ظاہری ہئیت کو مسخ کرنے کی ممانعت ہے ۔ مثلاً تذلیل، انتقام یا تفریح کے جذبہ سے کوئی ایک عضو یا متعدد ظاہری اعضاء کاٹ ڈالے جائیں یا شکل وصورت بگاڑ دی جائے ۔

اعضاء کی پیوند کاری

کسی شخص کی زندگی کے لیے ایک مردہ شخص کے کسی عضو کی پیوند کاری جائز ہے بشرطیکہ وہ شخص اپنی زندگی میں اس عضو کے عطیہ کا اعلان کر چکا ہو۔ گرچہ اس عمل سے مردہ کی کسی قدر بے حرمتی ہوتی ہے لیکن اس کا مقصد ایک اعلیٰ تر مفاد کا حصول اور ایک ناگزیر ضرورت کی تکمیل ہے اس لیے یہ جائز ہے۔ یہاں کوئی انتقامی جذبہ کارفرما نہیں ہوتا۔

ایک زندہ شخص کی صحت کی بقا ایک مردہ شخص کے جسم کی حرمت پر فوقیت رکھتی ہے اس لیے جو ارجح اور بڑتر مفاد ہے اسی کو ترجیح حاصل ہوگی ایسی صورتوں میں ممنوعات کا ارتکاب ہو سکتا ہے ۔

مسلم فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مردہ حاملہ عورت کا پیٹ چاک کرنا اس وقت جائز ہے جب اس سے نکالے جانے والے بچہ کے زندہ بچ جانے کی امید ہو۔ اس طرح مردہ شخص کے پیٹ سے کسی قیمتی زیور کے نکالنے کے لیے بھی اس کا پیٹ چاک کرنا جائز ہے ۔

عمومی مفاد کے تحت مردہ کے کسی عضو کا استعمال، چاہے وہ انسانوں کے علاج کے لیے ہو یا کسی کی صحت کی برقراری اس پر منحصر ہو یا اندھے پن یا موت سے کسی کو بچانا مقصود ہو، اسی وقت جائز ہے جب اس مردہ کا وارث اس عضو کے استعمال کی اجازت دے دے یا اس مردہ کا کوئی وارث ہی نہ ہو یا خود وہ شخص اپنی زندگی میں اس عطیہ کا اعلان کر چکا ہو ۔

زندہ شخص کے عضو کی پیوند کاری

زندہ شخص کے کسی عضو کی پیوند کاری صرف اسی صورت میں جائز ہے جب اس

کے پاس اسی عمل کو انجام دینے کے لیے اسی طرح کا کوئی عضو موجود ہو۔ مثال کے طور پر کسی شخص کا گردہ صرف اسی صورت میں نکالا جاسکتا ہے جب اس کے پاس دوسرا گردہ پوری طرح صحتمند ہو اور مطلوبہ عمل انجام دے سکتا ہو۔ لیکن اگر کسی کے پاس متبادل کوئی عضو موجود نہ ہو تو اس کے جسم سے وہ عضو نکالنا جائز نہ ہوگا۔ مثلاً کسی انسان کا دل دوسرے انسان کے جسم میں لگانا اس لیے ناجائز ہوگا کہ انسانی جسم میں دل ایک ہی ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں اصولی بات یہ ہے کہ ایک نقصان کی تلافی کے لیے اسی کے مثل نقصان پہنچانا درست نہیں ہے۔

دفع مضرت جلب منفعت پر فوقیت رکھتا ہے

اگر طبی ماہرین یہ سمجھتے ہیں کہ کسی صحت مند شخص کے جسم سے کسی عضو کو نکال لینے سے اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اور وہ شخص بھی اس عضو کو نکالنے اور کسی ایسے شخص کے جسم میں نصب کرنے کی اجازت دے دے جس کی زندگی اس عضو کی تنصیب پر منحصر ہو تو پیوندکاری کا یہ عمل جائز ہوگا۔ اس سے ایک مریض کی جان بچ جائے گی جبکہ صحت مند شخص محض ایک جزوی منفعت سے محروم ہوگا۔

مضرت کا خاتمہ ہونا چاہیئے

صحت کی حفاظت کے لیے سڑا ہوا عضو جسم سے علیٰحدہ کردیا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی درست ہے کہ مرض کے علاج کے لیے جسم کے کسی حصہ میں آپریشن کا عمل کیا جائے یا کوئی صحیح سالم دانت الگ کردیا جائے اگر اس کی موجودگی نقصان دہ ہو۔ اس طرح کا کوئی بھی آپریشن مثلہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس لیے یہ سب جائز اور درست ہیں ان کے ذریعہ فائدہ حاصل ہوتا ہے یا نقصان کا ازالہ ہوتا ہے۔

متصادم مفادات

صحت مند شخص کے جسم سے کسی عضو کا الگ کرنا اور کسی مریض کے جسم میں اس کی پیوندکاری ہنگامی اور ناگزیر صورت ہی میں جائز ہے۔ اس امر کا تیقن ضروری ہے کہ جس شخص کے جسم سے عضو الگ کرنا ہے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور جس کے جسم میں پیوندکاری ہونی ہے یہ پیوندکاری کامیاب ہوگی

اس طرح بڑے نقصان سے بچنے کے لیے ہم ایک چھوٹے نقصان کا ارتکاب کرتے ہیں۔

کسی فرد کو زندگی کا وسیلہ فراہم کرنا عظیم احسانات میں سے ایک ہے۔ کسی آدمی کے جسم سے کوئی عضو الگ کر کے کسی قریب المرگ شخص کے جسم میں اس کی پیوندکاری اسے خدا کی مرضی سے ایک نئی زندگی بخشتی ہے۔ اس طرح ایک شخص موت کے منہ سے بچا لیا جاتا ہے۔

ضرورت کو بھی مجبوری کے مثل سمجھا جائے

عام حالات میں جو امور ناجائز ہوتے ہیں مجبوری میں وہ جائز ہو جاتے ہیں۔ یہ اصول کسی شخص کے طبی علاج پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ بہت سے مریض، مرض اور اس کے خطرات سے حفاظت کے لیے عضوی پیوندکاری کے محتاج ہوتے ہیں۔

شریعت نے ہمیں اپنی بیماریوں کا علاج کرنے اور اپنے جسموں کی حفاظت کا حکم دیا ہے۔ اس علاج میں یہ بات بھی شامل ہے کہ بعض حالات میں کسی صحت مند شخص کے جسم کا کوئی عضو مریض کے جسم میں نصب کیا جائے جس کے بغیر اس کا زندہ رہنا ممکن نہ ہو۔ اگر کوئی مستند ڈاکٹر یہ یقین دہانی کرائے کہ مطلوبہ عضو کو نکال لینے سے اس شخص کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا تو یہ علاج حرام نہیں ہوگا اس لیے کہ نقصان پہنچائے بغیر ایک عظیم فائدہ حاصل ہو رہا ہے۔

ایثار کا پہلو

اسلام نے ایثار کی تعلیم دی ہے۔ ایک شخص دوسروں کو کھانا اور پانی دیتا ہے گرچہ وہ خود اس کا ضرورت مند ہوتا ہے اور اس اندیشہ کے باوجود کہ اس کے بغیر وہ کم زور ہو جائے گا۔ یہی ایثار کا جذبہ اس وقت بھی کام کرتا ہے جب کوئی اپنا عضو کسی کو اسی لیے ہبہ کرتا ہے جس سے اس کی زندگی بچ جائے اور خود کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اس طرح کا عطیہ مریض کے حق میں بڑا احسان تصور کیا جائے گا بالخصوص اس صورت میں جبکہ مریض اس کا قریبی رشتہ دار ہو یا وہ ایسا شخص ہو جس کا، یہ عطیہ کرنے والا احسان مند یا مقروض ہو۔

تعاون کا پہلو

اسلامی شریعت نے امت کو باہمی تعاون کی تعلیم دی ہے تاکہ ان کے درمیان محبت و

رحمدلی کے رشتے استوار و پائیدار ہوں اور وہ جسم واحد کی طرح محسوس ہوں۔ کسی شخص کا خود کو نقصان پہنچائے بغیر دوسرے کی زندگی بچانے کی خاطر کوئی عضو دے دینا اتحاد امت کی معراج اور تعاون کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔

خلاصۂ بحث

مذکورہ بالا سطور میں ایک ایسے مسئلہ میں اجتہاد کے ذریعہ قانون سازی یا فیصلہ صادر کرنے کی وضاحت کی گئی ہے جس میں شریعت کا کوئی واضح حکم موجود نہیں ہے۔

فقہ اسلامی کے ارتقاء کے لیے یہی ایک راستہ ہے جس کے بارے میں ہمارا خیال یہ ہے کہ وہ ہر زمانہ کے لیے مفید و کارآمد ہے۔ اس کے ذریعہ لوگوں کی ضرورتیں پوری ہوئی ہیں۔ ان کے مطالبات حاصل ہوئے ہیں اور ان کے مسائل حل ہوئے ہیں۔

کوئی عمل جس کے حلال یا حرام، جائز یا ناجائز ہونے کی صراحت موجود نہ ہو اگر وہ لوگوں کے مفادات کی تکمیل کر رہا ہو تو اس کی اجازت دے دی جائے گی۔ ہمیں یہ امید نہیں ہے کہ کوئی شخص اعضاء کی پیوندکاری کے ذریعہ حاصل ہونے والے نتائج اور اس طرح افراد امت کو صحت مند رکھنے سے امت کو حاصل ہونے والے فوائد و ثمرات کا منکر ہوگا۔

بعض اعتراضات کا جائزہ

اعضاء کی پیوندکاری کے سلسلہ میں ہونے والے اہم اعتراضات درج ذیل ہیں۔

(۱) اس عمل سے مردے کو تکلیف ہوتی ہے اس لیے یہ جائز نہیں ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ مردہ کی ہڈی کو توڑنا ویسا ہی ہے جیسا زندہ کی ہڈی توڑنا"۔

اس حدیث کو گوشت اور اعضاء کو الگ کرنے پر بھی محمول کیا گیا ہے۔ لیکن یہ بات واضح نہیں ہے کہ حدیث میں مذکور مماثلت کا تعلق تکلیف سے ہے یا گناہ سے۔ اس اشتباہ سے مذکورہ بالا اعتراض قوی نہیں رہ جاتا۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ مردہ کی ہڈی کو توڑنا اتنا ہی بڑا گناہ ہے جتنا زندہ شخص کی ہڈی توڑنا۔ اس روایت کے لحاظ سے تو بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ اس اعتراض میں کوئی وزن نہیں ہے۔

(۲) یہ خود کو ہلاک کرنے کا عمل ہے۔ یہ اعتراض سورۃ بقرہ کی آیت ۱۹۵ سے مستنبط ہے جس

میں کہا گیا ہے کہ "اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو" اعضا کے عطیہ کو اپنی ہلاکت کے مماثل قرار دیا گیا ہے۔ لیکن آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت خودکشی یا اس کے مشابہ کسی عمل کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہے۔ عضوی پیوند کاری کو اس کے مشابہ سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ البتہ اس آیت سے اعضا کی پیوند کاری میں ایک تحدید عائد ہوتی ہے۔ اس سے کسی ایسے عضو کو نکالنا ممنوع قرار پائے گا جو انسان کے جسم میں ایک ہی ہو اس لیے کہ اس کے نکال لینے سے انسان کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ لیکن جب کوئی عضو دو ہوں تو ان میں سے ایک کسی کو دے دینا بشرطیکہ صحت اس کی اجازت دے، جائز ہوگا۔

(۳) ان اعضا سے آخرت میں بھی کام لیا جائے گا۔

قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ یقیناً کان، آنکھ، اور دل سب سے آخرت کے روز سوال کیا جائے گا۔ (۱۷: ۳۶) اس آیت سے یہ استنباط کیا گیا ہے کہ اگر پیوند کاری کے لیے ان اعضا کو نکال لیا جائے گا تو آخرت میں وہ اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہی کے لیے موجود نہ ہوں گے۔ لیکن اس آیت کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان جسمانی اعضا سے سوال نہیں کرے گا بلکہ روح سے سوال کرے گا اور اگر یہ جسمانی اعضا ہی مراد ہوں تو کیا اللہ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ان اعضا کو واپس لے آئے جنھیں جسم سے الگ کر لیا گیا ہے۔

(۴) اعضا، اللہ کی امانت ہیں۔ انسان اپنے جسمانی اعضا کا مالک نہیں ہے کہ وہ جس عضو کو چاہے کسی کو ہدیہ کر دے۔

قرآن یا حدیث میں کوئی ایسی نص موجود نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ انسان کو اپنے اعضا کا جو امین بنایا گیا ہے اس کا معاملہ دنیا کی دوسری امانتوں سے مختلف ہے۔ انسان کو آسمانوں اور زمین کی تمام چیزوں کا امین بنایا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:۔

کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے جو کچھ زمین میں ہے (۲۲ : ۶۵)

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

"کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے تمہارے لیے مسخر کر دی ہیں وہ تمام چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور تم پر اپنی نعمتیں تمام کر دیں کھلی ہوئی بھی اور چھپی ہوئی بھی"۔ (۳۱ : ۲۰)

انسان کو یہ اجازت ہے کہ کائنات کی تمام چیزوں کو مناسب طریقے سے استعمال کرے۔ شرط یہ ہے کہ وہ انھیں اللہ کی امانت سمجھے اور اس کی مرضی کے مطابق ہی اس کا استعمال کرے یعنی اس نے

حلال وحرام اور جائز وناجائز کی جو حدود متعین کی ہیں ان کی رعایت کرے۔ انسان کو اپنے جسم پر بھی بس اسی قدر تصرف کا اختیار ہے جو اللہ کو پسند ہے۔

(۵) اعضاء کے ہبہ کرنے کی کوئی قطعی دلیل موجود نہیں ہے۔ قرآن وحدیث میں ایسی کوئی صراحت نہیں ہے جس سے اس فعل کے جائز یا ناجائز ہونے کا حکم لگایا جاسکے۔ جس فعل کی ممانعت آئی ہے وہ مثلہ ہے اسے اعضاء کی پیوندکاری سے مماثل قرار دینا صحیح نہیں ہے کسی چیز کی ممانعت کا مطلب اس میں مفید عنصر کی بجائے مضر عنصر کا غلبہ ہے۔ جہاں تک اعضاء کی پیوندکاری کا عمل ہے تو مردہ جسم سے کسی عضو کو نکالنا اور اسے جسم کے ساتھ دفن نہ کرنا اس کی قباحت اس وقت قابل توجہ نہیں رہتی جب یہ دیکھا جائے کہ اس عضو کے ذریعہ انسانی زندگی کے بچانے کا ایک غیر معمولی کارنامہ انجام دیا گیا ہے۔ اسلام زندہ افراد کی رعایت اور احترام کو مردہ کی رعایت واحترام کے مقابلہ میں ترجیح دیتا ہے۔

(۶) اعضاء کا ہدیہ ایک بدعت ہے۔

یہ عام تصور ہے کہ مسلم میت میں کسی قسم کا تصرف نہیں کرنا چاہئے جس طرح رسول اکرمؐ اور صحابہ کرام کے زمانہ میں ہوا کرتا تھا۔ بات یہ ہے کہ آج کے مسلمانوں میں بہت سی بدعتیں ایسی رواج پا گئی ہیں جنھیں تسلیم کرلیا گیا ہے اور ہر بدعت ممنوع بھی نہیں ہے۔ چنانچہ کسی کی جان بچانے کی خاطر یا طبی تحقیق کے لیے مردہ جسم سے کسی عضو کا نکالنا یا سبب موت کی واقفیت کے لیے پوسٹ مارٹم کرنا قابل اعتراض نہیں ہوسکتا۔

رسول اکرمؐ کے زمانہ میں اس کی نظیر اس لیے نہیں ملتی کہ فن طب اس وقت تک اس قدر ترقی یافتہ نہیں تھا آج جبکہ اعضاء کی پیوندکاری ممکن ہوگئی ہے اس لیے ہمیں اس میں اجتہاد سے کام لینا چاہئے ایک زندہ شخص کو اپنی جان بچانے کے لیے دوسرے کا عضو درکار رہے یہ خود اس لازمی ضرورت میں آتا ہے جس کے لیے حرام چیز بھی مباح ہوجاتی ہے۔

(۷) عضو کا عطیہ قبول کرنے والا عطیہ دینے والے شخص کے ساتھ جنت میں جائے یہ ضروری نہیں ہے۔

یہ خیال اللہ تعالیٰ کی اس قدرت پر حرف لانے کے مترادف ہے کہ وہ انسانی جسم کے اعضاء کو یکجا کرنے پر قادر ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو تباہ شدہ یا کسی دوسرے جسم میں نصب شدہ عضو بھی جنت یا جہنم اصل انسان کا حصہ بن جائے گا وہ تو صرف یہ حکم دے گا کہ ہوجا اور ایسا واقع ہوجائے گا۔

تعارف وتبصرہ

ایرانی تصوّف

پروفیسر کبیر احمد جائسی

ناشر: ادارۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ طبع اول ۱۹۹۳ء
صفحات ۲۱۶ قیمت ۸۰ روپے۔

پروفیسر کبیر احمد جائسی کی علمی وادبی خدمات محتاج تعارف نہیں ہیں۔ ابھی حال ہی میں انھیں فارسی زبان کی خدمات پر ملک کے صدارتی ایوارڈ کے لیے بھی منتخب کیا گیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب دراصل ایران کے مشہور دانشور سعید نفیسی کی کتاب "سرچشمہ تصوف در ایران" کا مفصل تعارف ہے جس میں کہیں کہیں مختصر تنقیدی تبصرے بھی موجود ہیں۔

کتاب کی ابتدا ادارۂ علوم اسلامیہ کے موجودہ ڈائرکٹر سالم قدوائی کے سرسری پیش لفظ سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد صفحہ ۱۵۴ تک اس کتاب کا مطالعہ وجائزہ ہے اور باقی صفحات حواشی کے لیے وقف ہیں جن میں کتاب میں مذکور شخصیات کا اجمالی تعارف درج ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے پروفیسر جائسی کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے کہ سعید نفیسی کا رویہ ایرانی تصوف اور نفس تصوف کے سلسلہ میں غیر منطقی ہے اس کا ذہن گنجلک اور غیر واضح ہے اور غیر ضروری طور پر وہ آریائی توارث کے قائل نظر آتے ہیں۔

پروفیسر جائسی کے مطابق یہ کتاب تصوف مخالف ہے اور حوالوں اور مآخذ سے بے نیاز، نیز یہ کہ سعید نفیسی ایرانی تصوف کو اسلام مخالف جذبات کا زائیدہ وپروردہ سمجھتے ہیں اور اسے شعوبیت کی انتہائی شکل قرار دیتے ہیں۔ نفیسی نے ایرانی تصوف کو عربی تصوف سے قدیم تر اور متعدد امتیازات واوصاف کی بنا پر ایک متمائز فلسفہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان کے مطابق ایرانی تصوف کا رشتہ بودھ مت کے عقائد سے ملتا ہے جس میں مانوی مذہب کے بھی بہت سے اجزا شامل ہیں۔ یہ ایرانی تصوف، عراقی اور جزائری تصوف اور مغربی (شامی، مصری اور اسپینی) تصوف تینوں کے سرچشمے جدا جدا ہیں۔ نفیسی کے نزدیک

ایرانی تصوف کے امتیازات میں شریعت سے بے گانگی طریقت پر انحصار، خانقاہوں کا نظام، سماع ورقص، جواں مردی وفتوت کے طریق ورسوم شامل ہیں جو اسے دیگر علاقوں کے تصوف سے جدا کرتے ہیں۔ علامہ اقبال نے جن کی نظر ایرانی تصوف پر بڑی گہری ہے خواجہ حسن نظامی کے نام ایک خط میں یہ لکھا تھا کہ "ایرانی تصوف نے ہر قوم کی رہبانیت سے فائدہ اٹھایا ہے اور ہر واہی تعلیم کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی ہے یہاں تک کہ قرمطی تحریک سے بھی.... محض اس وجہ سے کہ قرمطی تحریک کا مقصد بھی بالآخر قیود شرعیہ اسلامیہ کو فنا کرنا تھا"۔ ورنہ جہاں تک نفس تصوف کا تعلق ہے اس میں وہ تفریق کے قائل نظر آتے ہیں۔ "ادبیات تصوف کا وہ حصہ جو اخلاق وعمل سے تعلق رکھتا ہے۔ نہایت قابل قدر ہے کیونکہ اس سے سوز وگداز حاصل ہوتا ہے البتہ اس کا وہ حصہ جو فلسفہ سے تعلق رکھتا ہے وہ بے کار محض ہے اور بعض صورتوں میں تعلیم قرآن کے مخالف"۔

سعید نفیسی کی کج فکریوں کے باوجود اس کتاب کے مطالعہ کو مصنف نے دو وجوہ سے ضروری سمجھا ہے اول یہ کہ سعید نفیسی ادارہ علوم اسلامیہ علی گڑھ کے اوّلین اساتذہ میں سے ہیں اس لیے ان کے علمی کارناموں کا تعارف اس پر واجب ہے دوسرے یہ موضوع اس ادارہ کے نصاب میں شامل ہے جس کے ہر پہلو پر اساتذہ وطلبہ کی نظر ہونی چاہیے۔

تبصرہ نگار کی نظر میں یہ کتاب طالب علموں کے لیے تو کم محققین اور اساتذہ کے لیے کسی حد تک قابل توجہ ہو سکتی ہے اس لیے کہ اس کے اندر جو تضاد بیانیاں ہیں اور تجزیہ وتحلیل کی جو نارسائیاں ہیں ان کی گرفت ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔

کتاب کے تعارف میں مصنف کا یہ طریق قابل تحسین ہے کہ نفیسی کے بیشتر خیالات کو ان کی اصل زبان (فارسی) میں پیش کرکے ذیل میں ان کا ترجمہ کر دیا گیا ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مصنف کی ترجمانی میں انھوں نے پوری دیانت داری سے کام لیا ہے۔ درمیان میں کہیں کہیں عربی عبارتوں کے ترجمے بھی ہیں جن میں بیشتر محل نظر ہیں۔

(ڈاکٹر منور حسین فلاحی)

اسلام اور اکیسویں صدی کا چیلنج

مصنف: اسرار عالم

ناشر: دین ودانش پبلیکیشنز دہلی۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ ذکری مٹیا محل دہلی ۶

طبع اول ۱۹۹۶ء صفحات ۱۱۴ قیمت =/۲۵

آج جبکہ دنیا اکیسویں صدی میں داخل ہوا چاہتی ہے، مختلف حلقوں کی جانب سے مختلف ردعمل سامنے آرہے ہیں۔ نئی صدی کے لیے کیا لائحہ عمل ہونا چاہیے؟ اس کے لیے کیسی تیاریوں کی ضرورت ہے؟ انسانوں کو کیا مسائل درپیش ہیں؟ دنیا کے سامنے کیا چیلنجز ہیں؟ ان سوالات کے تعلق سے مختلف دانشوراپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں مسلمانوں کو بحیثیت امت مسلمہ کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ یہ ہے وہ سوال جس کا زیرتبصرہ کتاب میں جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتاب میں بنیادی طور پر تین مباحث ہیں۔ اولاً مصنف نے "روایتی ملی احساس" رکھنے والے ان افراد کے بارے میں جو نئی صدی میں داخلہ کے لیے مسلمانوں اور مسلم ملکوں کو اپنا جائزہ لینے کی بات کرتے ہیں۔ اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ان کی فکر "نقالی، کم نگاہی یاسطحیت" پر مبنی ہے (ص۵) پھر اس اندازفکر کے تین اسباب قرار دیے ہیں۔ (۱) تمسک بالکتاب والسنہ کا حق ادا نہ ہونا۔ (۲) عجلت پسندی اور (۳) معاصر طاغوتی افکار سے مغلوبیت دوسری بحث میں مصنف نے عصر حاضر کے مغربی نظام کو جاہلی قرار دیتے ہوئے اس کی قدروں پر روشنی ڈالی ہے اور انسانی زندگی کے انفرادی واجتماعی پہلوؤں مثلاً طبیعیات، حیاتیات وعمرانیات، فنون لطیفہ، سیاسیات وغیرہ پر اس جاہلیت خالصہ کی بالادستی کا تذکرہ کیا ہے انھوں نے واضح کیا ہے کہ اس بالادستی کی وجہ سے بحر وبر میں فساد برپا ہوگیا ہے۔ یہ فساد ماحولیات میں بھی ہوا ہے۔ اخلاقیات میں بھی۔ معاشرت میں بھی اور سیاسی، معاشی، عمرانی اور روحانی نظاموں میں بھی۔ مصنف نے خاص طور سے معاش، ماحولیاتی اور عسکری میدانوں میں فساد کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی اس سنت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ راہِ اعتدال سے بہک جانے والی قوموں کو ایک مقررہ مدت تک مہلت دیتا ہے۔ مگر جب ان کے راہ یاب ہونے کی تمام امیدیں منقطع ہوجاتی ہیں تو وہ انھیں ہلاک کردیتا ہے۔ ایسی صورت حال میں امت مسلمہ پر کیا فرض عائد ہوتا ہے؟ اور وہ شہادت علی الناس کی ذمہ داری کیسے انجام دے؟ مصنف نے اسے تیسری بحث کا موضوع بنایا ہے اور اس کے چار مراحل قرار دیے ہیں۔

یہ کتاب موجودہ حالات پر ایک فکر انگیز تجزیہ اور امت مسلمہ کے سوچنے سمجھنے والے

طبقہ کو حرکت و عمل پر آمادہ کرنے کی ایک کوشش ہے۔ کتاب کی اس خوبی کے ساتھ تبصرہ نگار چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہے:

۱۔ مصنف نے مغربی جاہلی نظام کی ہلاکت خیزیوں اور فساد کے مظاہر پر روشنی ڈالتے ہوئے اقتصادی، ماحولیاتی اور عسکری پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اسی قدر تفصیل کے ساتھ اخلاق و معاشرت کے پہلو سے بحث کی تشنگی محسوس ہوتی ہے۔

۲۔ مصنف نے بعض مقامات پر ضروری تفصیل سے بھی اجتناب کیا ہے۔ مثلاً انھوں نے شہادت علی الناس کی بحث میں اس کے مراحل کا تذکرہ بس اشاروں میں کیا ہے۔

۳۔ بہت سے مقامات پر احادیث اور عربی عبارتوں کے ترجمے نظر ثانی کے محتاج ہیں (مثلاً ص۸ ص۹ ص۲۷ ص۵۵ ص۶۲ ص۶۶ ص۶۸ ص۶۹ ص۷۰ ص۸۲

۴۔ کتاب میں زبان بہت ٹھیٹھ استعمال کی گئی ہے۔ حالانکہ ان ہی افکار و خیالات کو آسان زبان میں پیش کیا جا سکتا تھا۔ شئونات ص۶۰ (صحیح لفظ شئون بمعنی احوال) مقتدیت ص۷۹ (صحیح لفظ اقتدا بمعنی اتباع) اغلباً ص۶۶ Organism کا ترجمہ متعضیات ص۲۴ Accumulation کا ترجمہ اجماع ص۲۴ Technology کا ترجمہ طریقۂ فنیت یا علم الفنیت ص۲۴ اس کی چند مثالیں ہیں۔ ہر جگہ نشأۃ الثانیہ لکھا گیا ہے جبکہ صحیح لفظ نشأۃ ثانیہ ہے (بغیر ال کے)

بہر حال یہ کتاب ایک عصری موضوع پر اسلامی نقطۂ نظر سے غور و فکر اور تجزیہ کا اچھا نمونہ ہے۔

(محمد رضی الاسلام ندوی)

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی کی ایک اہم کتاب

ایمان و عمل کا قرآنی تصوّر

الطاف احمد اعظمی

○ ایمان و عمل کے مروجہ تصور کی کمزوریوں کی نشان دہی کرتی ہے۔ ○ قرآن و سنت کے نقطۂ نظر کی مدلل اور دلنشیں تشریح کرتی ہے۔ ○ ایمان و عمل کے تقاضے اور دنیا اور آخرت میں کامیابی کی راہ واضح کرتی ہے۔

آفسٹ کی طباعت۔ خوبصورت سرورق۔ صفحات ۲۸۰ قیمت ۲۵ روپئے لائبریری ایڈیشن ۴۰ روپئے

ملنے کا پتا: ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی۔ پان والی کوٹھی۔ دودھ پور۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲